نئے ناقوس میں پھونکی ہے جسنے روح وہ میں ہوں
ابھی موجود ہیں اہل کلیسہ دیکھنے والے

سوانح نور جہاں بیگم

یعنے

شہنشاہ جہانگیر کی ملکہ محبوبہ کے محقق اور صحیح حالات اور مشہور عالم سوانحعمری

جسے

ابوالفخر مولوی شیخ عاشق حسین صاحب سیماب صدیقی الوارثی اکبرآبادی

نے تالیف کیا اور

باہتمام ایس۔ ریاض الدین
الیکٹرک ابوالعلائی پریس آگرہ میں چھاپا گیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی جو پنہاں ہو گئیں

بدنصیب ہندوستان اُسوقت دیکھنے اور سیر کرنیکے قابل ہوگا جب اسکے مختلف باغوں میں مختلف ممالک کے تازہ اور شاداب پھول ہر طرف لہلہا رہے ہونگے - اونکی خوشبوے مشام انگیز سے دماغ عالم معطر و معنبر ہوگا خصوصاً وہ پھول جو فطرتاً لطیف اور نازک ہونگے اپنی لطافت و نزاکت کی جلوہ ریزی میں اپنا جواب نہ رکھتے ہونگے اونہیں پھولوں میں سے **نورجہاں** بھی ایک پھول تھی جسکی تازگی اور لطافت گلکدۂ تاریخ کے اوراق پریشان پر ہنوز بہار آفرین ہے

خزاں ہوا گلشن شگفتہ گلستان کچھ بھی نہ باقی
رہیگی یاد گلوں کی لطافت ابھی نہ کہنے ہی ہے

نورجہاں کی کئی سوانح عمریاں قابل اور ادبی انشاپردازان ملک نے لکھی ہیں نیز مغربی سیاحوں اور مورخوں نے نورجہاں کی زندگی پر کافی روشنی ڈالی ہے لیکن جسطرح رخسار یار کو صرف گلاب و ماہتاب کہہ دینے سے تسلی نہیں ہوتی اور جی چاہتا ہے کہ کوئی اور حسین تشبیہ دیجائے اسیطرح طبیعت تقاضا کرتی ہے کہ نورجہاں کے ذکر سے گو بیشتر صفحات معرّی ہوچکے ہیں پھر بھی اوسکا ذکر جمیل ہنوز جاری رہے تو اچھا ہے

کرچکا ہوں ذکر تیرا اور کرونگا پھر بہت ہم جلیس کنج تنہائی اسے پاتا ہوں میں

نورجہاں کی لائف سے جو نتائج اور سبق ہمیں حاصل ہوتے ہیں وہ اگر بہ نگاہ انتخاب دیکھے جائیں اور ان پر تعصب سے الگ ہو کر تنقید کیجائے تو انسان کی ہستی کا راز اور بدیہات فطرت کے اسرار سے پردہ اٹھ سکتا ہے۔ اس لائف سے قدرت قادر کا اختیار کا مختصر شمع ہے اور فطرت انسانی کے جوہر کلیتہً جلوہ گر ہیں۔ انسان اپنی قسمت کے مستقبل سے اسیطرح بیخبر ہے جسطرح وقت تخلیق سے قبل علیم الاشیاء اور وقوف ہستی سے نیز اپنی حالت واقعیہ سے بیخبر آگاہ و بیخوف تھا آپ اس لائف میں بیکسی کی پیدائش، اور شاہانہ طرز آسائش صبر کی آزمائش اور پردہ حسن سے عشق کی نمائش دیکھیں گے تو آپ کو قدرت الٰہی کے وہ مناظر نظر آئینگے جن کا نظارہ آپکی چشم باطن میں چکاچوند پیدا کر دیگا ؎

[illegible] تو ہر ایک رنگ ہے تاریخ چمن لکھنے والے نے کوئی بات اٹھا رکھی ہے

تاریخ بینی سے جسقدر ہندوستان میں دلچسپی بڑھتی جاتی ہے اسیقدر سوانح نگاری میں بھی ترقی ہوتی جاتی ہے لیکن آج کل کسی قسم کی سوانح عمری لکھ کر ایک [illegible] خالی از خطر نہیں ہر مصنف یا مولف اپنے علم کے زعم میں دوسروں کی تالیفات وتصنیفات میں عیوب چینی کے لئے تیار ہے اور ایسی نگاہیں بہت کم ہیں کہ اچھی چیز کو انتخاب کرلیں اور بری چیز کو چھوڑ دیں "خذ ما صفا ودع ما کدر" پر عمل کرنیوالے مقدس نفوس دنیا میں عموماً اور ہندوستان میں خصوصاً بہت کم ہیں ابھی ایک تصنیف یا تالیف کو میدان اشاعت میں نمودار ہوئے پہلا دن ہوتا ہے کہ اس پر چاروں طرف سے اعتراضات کی بوچھار ہونے لگتی ہے۔ فرمائیے لکھنے والوں کو دل

کیونکر بڑہے ؎ تم تو ذکر وصل کرتے ہی خفا ہونے لگے
داستانِ شوق سن لوگے تو کیا ہو جاؤ گے

سوانح نگار جن واقعات کو مترتب کرتا ہے وہ عموماً افسانہ ہائے پیشین سے لیے جاتے ہیں آرائے کا اختلاف دوسری بات ہے کہ مصنف و مؤلف کی رائے جدا جدا ہوتی ہے۔ ایک ہی واقعہ ایک صاحب الرائے کی نگاہ میں اچھا اور دوسرے کی نظر میں معیوب نظر آتا ہے۔ مگر یہ اپنا اپنا خیال اپنی اپنی تحقیق اور رسائی ہے۔ مخالف آرا سے بُرا ماننا بڑی بات ہے کہ سوانح نگار کوئی واقعہ اپنی طرف سے گڑھ کر لکھ نہیں سکتا لکھے گا وہی جو اس تک روایات کے ذریعہ سے پہنچا ہے پس واقعات کی عمومیت مؤلف کے علمی تجربہ سے ذرا بھی مستغنی نہیں کرتی۔

یہ سوانح عمری جو اسوقت آپ کے ہاتھ میں ہے تمام دوسری سوانح عمریوں سے بہر نوع وبہر صورت مرجح ملے گی اور زبان کی چاشنی سے جو لوگ لذت آشنا ہیں وہ یقیناً اس ترتیب شیریں کی داد دیں گے۔ کہ جو لطف بیان آپ کی زبان میں ہے وہ دوسری زبانوں کو نصیب نہیں ؎

ہزاروں سے سنے یہ لفظ لیکن لطف سے تھے خالی
تمہاری بات کی شوخی تمہاری ہی زبان تک ہے

آگرہ

سیماب

۲۰ - فروری ۱۹۲۰ء

صدیقی الوارثی اکبرآبادی

نورجہاں

نورجہاں کے جدامجد جنکا نام خواجہ محمد شریف تھا طہران کے ایک زبردست
عالم و فاضل امیر کبیر تھے اور ننہال میں بھی امارت و فضیلت کی کچھ کمی نہ تھی خواجہ
محمد شریف محمد خان تکلو حاکم خراسان کے دربار میں بعہدہ وزارت مامور تھے
پھر جب [illegible] سلسلہ صفوی ایران پر قابض ہوا تو یہ مرو کے گورنر بنا دیے گئے۔ عمر
نے بیوفائی کی۔ تاج وزارت سر پر رکھے تھوڑے ہی دن ہوئے تھے کہ پروانہ قضا آپہنچا
جنت میں انکی طلبی ہوئی اور یہ دار فنا کو خیرباد کہہ کر دارالبقا کی طرف روانہ ہوگئے
خواجہ محمد شریف کے دو بیٹے تھے۔ آقا طاہر اور مرزا محمد غیاث۔ مرزا محمد غیاث
کو لوگ آنکھوں میں جگہہ دیتے تھے لیکن محمد شریف کے قضا کرتے ہی اون کی وجاہت
وامارت [illegible] اور حسود کی نگاہوں میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگی۔ مرزا غیاث نے
بہت کوشش کی کہ لوگوں کے خیالات ان کی طرف سے صحیح ہوں لیکن یہ اپنی
کوششوں میں کامیاب نہ ہوسکے اور حاسد دل نے سر پر آرائے سلطنت کے
کان ان کی طرف سے ایسے بھرے اور اسقدر بار قرض خواجہ محمد شریف کے ذمہ
نکالا کہ مرزا غیاث حیران ہوکر رہ گئے۔ لاکھوں روپیہ کا قرض زمانہ ناموافق سلطنت
بدظن، زمین تنگ آسمان دشمن، کیا کریں کیا نہ کریں۔ یہ بیچارے اسی کشمکش میں
تھے کہ انکی جائداد منقولہ و غیر منقولہ کے ضبط کرنیکا سرکاری حکم پہنچا اور یہ دم بھر میں بے
خانماں ہوگئے۔ مرزا محمد غیاث کی شادی مرزا علاء الدولہ پسر آقا ملا کی دختر نیک اختر
عصمت النساء بیگم سے ہوئی تھی اور اس وقت تک دو لڑکے اور ایک لڑکی ان کے

بطن سے پیدا ہو چکے تھے چوتھا بچہ پیٹ میں تھا کہ اتفاقاً سلطنت نے جلاوطنی
کا حکم دیا۔ اور کہلا بھیجا کہ ایران چھوڑ کر فوراً ہندوستان روانہ ہو جاؤ ؎

ایک توگل سے جدا رکھا مجھے صیاد نے
اوس پہ یہ تاکید اوڑ جاؤ نشیمن چھوڑ کر

حکم حاکم مرگ مفاجات، تنگ آمد بجنگ آمد، مرزا غیاث بحالت مجبوری تھوڑا سا
سامان خورد و نوش لیکر معہ اپنی غمگسار بیوی کے ہندوستان کی طرف روانہ ہو گئے۔
چھوٹے بچے ہاتھ تھامے ہوئے ساتھ تھے اور انقلاب ہمرکاب تھا۔

ایران کے شگفتہ پھول خارزار قندہار میں

لے چلی وحشی بنا کر فتنہ سامانی مجھے
رونگی اب تاقیامت خانہ ویرانی مجھے

وہ مرزا غیاث جو شبستانِ وزارت کے ایک روشن چراغ تھے اور وہ عصمت النساء بیگم
جو شاہی محلوں کی رانی تھیں ایک قافلے کے پیچھے پیچھے اپنی بیکسی اور بے بسی پر آنسو
بہاتی ہوئی کبھی اونٹ پر اور کبھی پیدل چلے جا رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے نادان
بچے جنھوں نے پیادہ پائی کی مصیبت اس سے پہلے کبھی نہ اوٹھائی تھی۔ اپنے ماں
باپ کا منہ دیکھتے تھے جب تھک جاتے تھے تو رو دیتے تھے عصمت النساء بیگم
کی وجہ سے اور بھی مجبور تھیں۔ اس پر سفر کی مصیبت آنکھوں سے آنسو جاری
تھے۔ اور پاؤں ورم کر آئے تھے۔ بار بار آسمان کی طرف دیکھتی تھیں
اور کہتی تھیں ؎

اے آسمان ستا نہ دلِ زار کو مرے
بے خانماں ہوں اور غریب الوطن نہیں

صحرائے قندھار کی دشوار گذار وادیوں کے شروع ہوتے ہی عصمت النسا کے پیٹ میں دردِ زہ بھی شروع ہو گیا۔ یک نہ شد دو شد۔ بیچاری ایک درخت کے نیچے گھبرا کے بیٹھ گئی۔ اور درد کی وجہ سے بیتاب ہونے لگی۔ مرزا غیاث نے تسلی و تسکین میں کمی نہ کی لیکن سنسان جنگل کی بھیانک رات! درندوں کا شور چوروں کا خوف! یہ ایسی باتیں تھیں جو عصمت النسا کو مطمئن نہ کر سکیں۔ غریب روتی تھی اور دل میں خیال کرتی تھی کہ ایک دن میں چاندی اور سونے کی مسہری پر آرام کرتی تھی بیسیوں کنیزیں میری خدمت کیلئے تیار تھیں۔ آرام کے تمام سامان میرے لئے ضرورت سے زیادہ موجود تھے۔ میری ہر تکلیف خیال کرتے ہی ایک ذرا سے اشارہ پر راحت سے بدل جاتی تھی، اگر میرے پھانس چبھتی تھی تو میرے ہوا خواہوں کے دلوں پر چھریاں چل جاتی تھیں لوگ میرے پسینہ کی جگہہ اپنا خون گراتے تھے اور آہ! ایک دن یہ ہے کہ اس لق و دق جنگل میں بے یار و مددگار مبتلائے درد ہوں اگر میرے لئے کوئی فرش ہے تو جنگل کی خشک و زرد گھاس! چھتر ہے تو آسمان کی نیلی چادر! میرے مونس و ہمدم جانور ہیں اور بیکسی کے سوا کوئی غمگسار نظر نہیں آتی۔ یا الٰہی کسی درندے کو ہی بھیج دے کہ کسی غار سے نکلکر میرا کام تمام کر ڈالے۔ یا آسمان سے کوئی بجلی گر کر میرا فیصلہ کر دے۔ اُدھر مرزا غیاث نے اندھیری رات میں الاؤ جلا کر ننھے بچوں کو اپنے پاس بٹھا لیا تھا اور اپنی گذشتہ و آیندہ حالتوں پر نظرِ تنقید ڈال

رہا تھا بیوی کی بیکسی بچوں کی تکلیف اور اپنی خانہ بربادی کے خیال سے اسکا
دل بیٹھا جاتا تھا۔ مگر اوس کی مایوسی دعائیں مانگ رہی تھی۔ کبھی کبھی اوسکے
دونوں ہاتھ جانب آسمان اوٹھ جاتے تھے اور وہ چلانے لگتا تھا ؎

الٰہی رحم کن بر حال زارم — کہ از مایوسی خود بے قرارم
نگاہِ لطف بر بیچارگاں کن — مسرت از در قدرت عیاں کن

جب اوسکی بیقراری حد سے زیادہ بڑھ جاتی تھی تو انبیاء علیہم السلام کی مصیبتیں یاد
کرکے وہ اپنے دل کو ڈھارس بندھاتا اور اپنی بیوی کو بھی سمجھاتا تھا کہ وہ خدا جس
نے مریم علیہا السلام کی مدد کی تھی تمہاری بھی مدد کریگا۔ وہ اس واقعہ کو بار بار
پڑھتا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام بھی اپنی حاملہ بی بی کے ساتھ اسی طرح لق ودق
جنگل میں آئے تھے۔ مگر انوار الٰہی نے اون کی پیشوائی کی اون کی زحمتوں کو نوازا
اور انہیں اُسی عالم تردد وافکار میں ایک تسکین بخش ندائے غیبی کے ساتھ خلعت
نبوت بخشا۔ وہ اپنے انجام کار کی بہتری کا یقین رکھتا تھا اور یاس [illegible]
مناظر کو اپنے سامنے سے ہٹانا چاہتا تھا۔ مگر پھر بھی غریب الوطنی کے جذبات دوران
اوس کے آنسوؤں کو حرکت میں لے آتے تھے: چاند اپنی پوری روشنی کے
ساتھ فضائے عالم کو منور کر رہا تھا جنگل کا ذرہ ذرہ نوری لباس میں چمک
رہا تھا۔ درخت جھوم جھوم کے غافل انسان کو خدائے قیوم کی پوشیدہ
نعمتوں کا مژدہ سنا رہے تھے۔ کہ پچھلے پہر پردہ شب کی تاریکی میں عصمت
عصمت النسا بیگم نے وضع حمل کیا اور نوجہاں پیدا ہوئی۔ اس عالم بے یاری
میں لڑکی کا پیدا ہونا ایک دوسری مصیبت تھی مرزا غیاث اسکی پیدائش

سے کچھ خوش نہ ہوا۔ اور سوچا کہ یہیں تو قسمت خدا جانے کہاں کہاں لئے پھرے گی اور ہماری آوارگی کا انجام خدا جانے کیا ہوگا اس لڑکی کو ساتھ ساتھ لئے پھرنا کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے۔ بہتر یہی ہے۔ کہ اسی جنگل میں چھوڑ دیا جائے اور یہاں سے آگے کی راہ لیں یہ ارادہ اوس نے اپنی بی بی پر بھی ظاہر کیا۔ ماں کی مامتا کو کون نہیں جانتا وہ گو کیسی [illegible] میں تھی مگر شوہر کے اس ارادہ کو سنکر بیقرار ہو گئی۔ اور اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔ دنیا میں کون سی ماں ایسی ہوگی جو اپنی چھاتی پر پتھر کی سل رکھ کر اپنے دل کے ٹکڑے کو جنگل میں چھوڑ دیگی مگر شوہر کی فرمانبرداری کا احساس اس کو بھی زیادہ تھا۔ مجبوراً اسے مرزا غیاث کی رائے پر عمل کرنا پڑا۔ ماں نے ایک دن کی جان کو اسی درخت کے نیچے نرم نرم پتوں پر لٹا [illegible] کپڑے سے اوسکا جسم ڈھکا۔ اپنے ہاتھ کی انگوٹھی اسکے گلے میں ڈالی اور کہا [illegible] تیرا خدا حافظ ہے۔ میں تجھے چھوڑ کے جاتی ہوں۔ مجبور ہوں مصیبت زدہ ہوں خدا تجھ پر رحم کریگا تیری حفاظت اسی کے اختیار میں ہے وہ ہزاروں بچوں کو اسی طرح پالتا ہے تجھے بھی پالیگا۔ بچی اپنی ماں کو اگر زندہ رہے تو بیرحم اور ظالم نہ ٹھیرانا۔ کہ میں اپنی مصیبتوں سے خود ہی پریشان ہوں۔ یہ کہا ایک دفعہ اور اوسے دودھ پلایا۔ اور "فی امان اللہ" کہتے ہوئے ماں باپ دونوں وہاں سے رخصت ہو گئے۔ لڑکی پڑی ہوئی انگوٹھا چوس رہی تھی اور ماں کی نگاہیں بار بار اسکی طرف لوٹ رہی تھیں اور نثار ہو رہی تھیں آنسوؤں کا دریا ماں باپ کی آنکھوں سے جاری تھا۔ دل بانسوں اچھل رہا تھا۔ لڑکی کا خیال کلیجہ

مل رہا تھا۔ جبتک لڑکی نظر آتی کچھ صبر رہا لیکن جوں ہی وہ نظر سے غائب ہوئی بیوی بے اختیار چیخ مار کر شوہر سے لپٹ گئی۔ دونوں گلے ملکر خوب روئے اور جب ولکی سرحد اس اچھی طرح نکل چکی تو بچوں کو ساتھ لیکر آگے روانہ ہوئے۔ دوسرے روز ایک گانوں میں پہنچے مرزا غیاث انہیں ایک جھونپڑی میں بٹھا کر کچھ سامان ضروری لینے کیلئے باہر گیا اور ماں اپنی بچی کی یاد میں خون کے آنسو بہانے لگی۔

کرشمۂ قدرت

کہتے ہیں کہ جب فرعون کو معلوم ہوا کہ اوس کی سلطنت میں ایک ایسا لڑکا پیدا ہونیوالا ہے جو اوسکی جھوٹی خدائی کو خاک میں ملا دیگا اور اوس کی فرعونیت کے دعاوئی باطلہ کو مٹا کر رکھدیگا تو اوس نے ہر طرف منادی کرادی کہ آج سے جو لڑکا کہیں پیدا ہو میرے حکم سے فوراً اوسکا گلا گھونٹ دیا جائے اگر ماں باپ ایسا نہ کرینگے تو وہ قتل کرڈالے جائینگے اُسی زمانہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوتے تو اُن کی ماں نے جو فرعون کے محلوں میں ملازم تھیں فرعون کے خوف سے ایک صندوق میں بند کرکے انہیں دریائے نیل میں بہا دیا۔ کچھ لوگوں نے دیکھ لیا صندوق کو کنارہ سے لگایا۔ لاکے اور فرعون کے سامنے کھولا۔ اوسنے دیکھا کہ حسین بچہ پڑا ہوا انگوٹھا چوس رہا ہے۔ اور مسکرا رہا ہے اوس کے مسکرانے سے دل پر خاص اثر پیدا ہوا اور حکم دیا کہ اچھا اسے محلوں میں رکھو اور کسی کو رضاعت کیلئے مقرر کردو۔ خدا کی قدرت دیکھئے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رضاعت اونہیں کی ماں کے سپرد کی گئی۔ اور وہ آغوش مادر میں پرورش پانے لگے اور بالآخر ایک بڑے پیغمبر ہوئے اور

سنئے! جب یوسف علیہ السلام کو اونکے بھائیوں نے کنوئیں میں ڈالدیا اور سوچا کہ اب
یہ اس کنوئیں میں گھٹ گھٹ کر مر جائیں گے تو اللہ تعالےٰ نے ایک قافلہ کو اوس
کنوئیں پر پہنچا اور ایک شخص نے آپکو دیکھا اسمیں سے نکالا مصر لے گیا، اور چونکہ وہ سوداگر
تھا اور انسانی تجارت اوسوقت جائز سمجھی جاتی تھی اور انسان فروشی معیوب نہ تھی
اسلئے مصر میں لاکر زلیخا کے ہاتھ آپکو فروخت کر ڈالا۔ اور آخر کار آپ مصر کے بادشاہ ہوئے
ان دونوں واقعات کی تطبیق ہم نورجہاں کے واقعات سے کرنا چاہتے ہیں اور دکھانا
چاہتے ہیں کہ خدا کی قدرت کے کرشمے کسی وقت خاص اور کسی زمانہ مخصوص کے
کیلئے مختص نہیں ہوتے اوس کی عنایتیں، نوازشیں، مہربانیاں، اور رحم وکرم کی
ہوائیں ہر وقت اور ہر جگہہ چلتی رہتی ہیں اور اوس کی رحمت کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا
جب نورجہاں کو مجبور ماں باپ جنگل میں تنہا چھوڑ کر چلے گئے تو رحمت کے فرشتوں نے
اوسے فوراً گود میں اوٹھا لیا۔ کارخانۂ قدرت کی طرف سے ایک سانپ نورجہاں
کا محافظ مقرر ہوا۔ ابھی یہ سامان ہو ہی رہے تھے کہ ایک شخص کا وہاں گذر ہوا اور
اس نے دیکھا کہ ایک کالا سانپ غالباً اپنا من اُگل کر اوس کی محافظت کر رہا ہے
لیکن جب یہ اور قریب پہنچا تو معلوم ہوا کہ ایک سرخ و سفید بچہ ہے جس کے اردگرد
سانپ کنڈلی مارے بیٹھا ہے۔ پہلے تو یہ ڈرا کہ میں اس بچہ کو اوٹھاؤں اور مبادا
یہ سانپ مجھ پر حملہ کر بیٹھے۔ لیکن پھر ہمت کر کے ذرا آگے بڑھا تو وہ سانپ خود بخود
نورجہاں کو چھوڑ کر پیڑ پر چڑھ گیا۔ نووارد مسافر نے جلدی سے بچہ کو گود میں اوٹھا لیا اور
خوش خوش اپنے سردار کے پاس پہنچا جو ایک مشہور اور ذی عزت سوداگر تھا۔ اور جس
کا قافلہ ہندوستان جا رہا تھا۔ سوداگر بچہ کو دیکھکر بہت خوش ہوا حفاظت سے اوسے

اپنے پاس اونٹ پر بٹھالیا اور وہاں سے یہ قافلہ روانہ ہو کر سیدھا اسی گانوں میں
پہنچا۔ جہاں مرزا غیاث معہ اپنی بی بی بچوں کے مصیبت کی زندگی بسر کر رہا تھا اور
اس کی واماندگیوں نے اوسے دم لینے کے لئے ٹھہرا دیا تھا۔ یہاں پہنچکر سوداگر نے
ایک شخص کو ادہر اودہر بھیجا کہ کسی دودھ پلانے والی کو تلاش کر کے لائے تاکہ بچی اُسکے
سپرد کیجاوے۔ وہ شخص رضاعہ کی تلاش میں گھومتا پھرتا یہاں آیا جہاں مرزا غیاث
کا مختصر مگر مصیبت زدہ خاتون حسرت ویاس کے عالم میں پڑا [illegible]
تمہاری عورت ایک بچہ کو دودھ پلا سکتی ہے؟ ایران کی شاہی خاندان والی [illegible]
اپنے شوہر کا منہ دیکھنے لگی۔ اُسے اپنی امارت اور عزت وہیں چٹکیاں لیتی ہوئی محسوس
ہونے لگی۔ اپنی بچی کو یاد کر کے عصمت النسا بیگم چہاتی ہی نہیں آنکھیں بھی بھر آئیں
اور وہ زار و قطار رونے لگی۔ مرزا غیاث نے اس مصیبت وا[illegible]
اس وابستگی کو غنیمت جانا اوس شخص سے کہا کہ میری بی بی دودھ [illegible]
ہے اوس نے کہا کہ تم دونوں ہمارے سردار کے پاس چلو وہ لڑکی تمہارے سپرد کر دینگے
مرزا غیاث معہ اپنی بی بی کے سوداگر کے پاس آئے تو اوس نے ان کے چہرہ سے
آثار شرافت نمایاں دیکھ کر فوراً بغیر مزید دریافت حال لڑکی کو عصمت النسا کے سپرد
کیا۔ اور کہا کہ تم اسے دودھ پلاؤ ہم تمہیں اسکے عوض میں کچھ دیدیا کرینگے۔
عصمت النسا بیگم نے لڑکی کے گلے میں اپنی انگوٹھی دیکھی تو جوش مسرت سے اسکی
آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور چہرہ بشاش ہو گیا۔ مرزا غیاث نے اشارتاً پوچھا کیا
ہے؟ تو عصمت النسا بیگم نے جواب دیا کہ یہ تو تمہاری ہی بچی ہے۔ مرزا غیاث بھی
اس حسن اتفاق سے بیحد خوش ہوا اور اس واقعہ کو نور جہاں اور اپنی زندگی کے لئے

فال نیک سمجھا سوداگر نے یہ معلوم کرکے کہ یہ دو میاں بی بی ایکدم خوش ہو گئے ان سے حال دریافت کیا۔ اونھوں نے اپنا پورا افسانہ ادت بلفظہ کہہ سنایا جب سوداگر کو معلوم ہوا کہ مرزا غیاث خواجہ شریف کا لخت جگر ہے اور یہ اوس کی بی بی عصمت النسا بیگم ہے تو اوسکے دل پر ایک عبرت آفرین اثر پڑا اور اس نے فوراً عصمت النسا کیلئے پردہ کا انتظام کردیا۔ مرزا غیاث کی بھی آبرو کی گئی اور انکے بچوں کو بھی آرام دینے کی ہر مناسب کوشش عمل میں لائی گئی یہ پہلی برکت تھی جو نورجہاں کی وجہ سے مرزا غیاث اور عصمت النسا کو حاصل ہوئی۔ اور یہ سب کے سب بڑی عزت اور پورے آرام کیساتھ اسی قافلے کے ہمراہ ہندوستان پہنچے اور پھر اکبرآباد (آگرہ) میں آکر سوداگر کے ساتھ مقیم ہوئے۔

مرزا غیاث کی قسمت کا پانسہ

سوداگر ملک مسعود کے گھر میں نورجہاں کا باپ ماں اور بھائی بہن سب چین سے رہنے سہنے لگے اور نورجہاں ایک خاص خوبصورتی اور تناسب کے ساتھ نشو و نما پانے لگی ایک دن ملک مسعود دربار شاہی میں بمقام فتحپور سیکری پہنچا۔ باریاب ہوا اور قسم قسم کے تحفے تحایف دکھانے لگے۔ کہنے لگا کہ میں شہنشاہ کے لئے ایک بولتا ہوا لعل بھی لایا ہوں جو حقیقت میں اس قابل ہے کہ درج شاہی میں رہے۔ اسکے بعد مرزا غیاث نورجہاں اور اسکی والدہ کا مفصل حال سنایا اور جو جو واقعات صحرائے قندھار میں ان پر گذرے تھے تمام دکمال بیان کئے شہنشاہ اکبر نے حکم دیا کہ مرزا غیاث کو ہمارے حضور میں حاضر کرو چنانچہ ایک دن موقعہ پاکر ملک مسعود نے بڑی خوشی سے آگرہ میں مرزا غیاث کو

حضور میں پیش کر دیا مرزا غیاث کے پاس سلطان ہمایوں کا نوشتہ تھا جسمیں لکھا تھا۔
کہ ہمارے قیام ہرات کے موقعہ پر مرزا غیاث کے دادا نے ہماری بڑی خدمت کی اور
ہم اوس سے بیحد خوش ہیں۔ یہ نوشتہ اکبر کو دکھایا گیا۔ وہ مرزا غیاث سے ملکر بہت
خوش ہوا۔ اور مرزا غیاث کو اسی دن سے دیوان بیوتات کر دیا۔ اب تو مرزا غیاث
چھبیس کارخانوں کے مالک بنگئے تمام تجارت شاہی سے تعلق ہو گیا۔ کارخانوں
میں ان کا حکم چلنے لگا اور سرکار دربار میں آزادی کے ساتھ رسائی ہو گئی نورجہاں
اور اسکی ماں شاہی محلوں میں رہنے لگے اور تمام آسائشیں اس مصیبت زدہ خاندان کو
میسر آگئیں اسکے تمام درد اور مایوسیاں نیز غربت و مسافرت کی تکلیفیں خوشی سے بدل
گئیں اور سب خدا کا شکر کرنے لگے؎

اوسے فضل کرتے نہیں لگتی بار نہ ہو اس سے مایوس امیدوار

مہرالنساء

اب مرزا غیاث کو آگرہ میں رہتے سہتے پانچ برس ہو گئے اس عرصہ میں انکی وقعت پہلے سے زیادہ بڑھ گئی انکی لڑکی بھی پانچ
برس کی ہو گئی اور اسکے حسن و جمال میں اضافہ خاص ہوتا گیا۔ پانچویں برس اسکا
پہلا نام "مہرالنساء" رکھا گیا اور اس تقریب میں خوشی کے جلسے مرزا غیاث کیطرف سے
کئے گئے۔ وہ شخص جس نے گذر بسر کے لئے اپنی بیوی کو دودھ پلانے کی ملازمت
کیلئے اجازت دیدی تھی آج ہزاروں روپیہ اپنے ہاتھ سے اوٹھا رہا ہے اور وہ
ماں جو فلاکت و غربت کے خیال سے "زہرۂ عالم" نورجہاں کو جنگل میں بار آغوش
سمجھ کر چھوڑ آئی تھی سینکڑوں کنیزوں میں ملکہ بنی بیٹھی ہے سبحان اللہ یہ سب قدرت

کے کرشمے ہیں اور انسان اپنے مستقبل سے بالکل آگاہ نہیں ہے کہ کل کیا ہوگا
کوئی حالت دنیا میں ایک سی نہیں رہتی اور ہر حال میں ایک انقلاب پیدا ہو جاتا ہے
یہ نیرنگی ابتدائے عالم سے جاری ہے اور انتہائے عالم تک یوں ہی جاری رہے گی۔

تعلیم و تربیت

شاہی محلوں کا رہنا سہنا، نازمیں پلنا، لاڈ میں پرورش پانا، نوجوان بہت جلد
ہوشیار ہو گئی۔ اور چونکہ عصمت النسا بیگم شاہی محل کی اتالیقہ تھیں اسلئے اپنی لڑکی کو
نوشت و خواند میں بھی پہلے انہیں نے حصہ لیا۔ مہر النساء نے قرآن شریف بہت
جلد ختم کر لیا۔ اور ایسی خوش الحانی سے پڑھنے لگی کہ تمام محل شاہی میں دھوم ہو گئی اُس
کی پیاری اور بھولی آواز حسین صورت حسن سلیقہ دیکھ کر تمام شہزادیاں اس پہ
نثار جاتی تھیں۔ ور اسکی دیکھنے والیاں اسے آنکھوں پہ بٹھاتی تھیں ۵ برس
تک مہر النساء نے زری کا کام سینے پرونے کا کام کشیدہ کاری وغیرہ وغیرہ ہنر زنانہ
تعلیم کے ساتھ حاصل کئے اسکے بعد ایک معتبر شخص مرزا ہادی اسکی تعلیم کے لئے مقرر
کئے گئے انہوں نے بہت جلد پوری محنت کے ساتھ گلستاں۔ بوستاں۔ انوار سہیلی۔
مینا بازار۔ یوسف زلیخا وغیرہ کتابیں پڑھا دیں عربی میں بھی کافی مہارت پیدا کر دی
الف لیلا اور کلیلہ و دمنہ کے افسانے اوسے یاد ہو گئے۔ اور وہ فارسی عربی میں پوری
قابلہ ہو گئی دس برس کی عمر میں مہر النساء نے اتنا کچھ سیکھ لیا کہ دوسری لڑکیاں
بیس برس میں بھی نہ سیکھ سکتیں۔ نیزہ بازی، تیر اندازی، شہسواری، تفنگ بازی
وغیرہ سپاہیانہ فنون اس نے اپنے باپ اور بھائیوں سے سیکھے تیرنا۔ ماہی خانم

سے سیکھا اور ہندوانہ مذاق کے ہنر بھی ہندو رانیوں سے حاصل کر لئے دسویں
برس وہ اپنی خوش سلیقگی، تہذیب، متانت، علم عقل حسن اور سیرت کے لحاظ
سے ایک اچھی شہزادی، اچھی ملکہ، اور ایک سگھڑ بی بی بن گئی جس نے محل شاہی
کے رہنے والوں اور رہنے والیوں کے دلمیں پورا رسوخ اور وقار حاصل کر لیا شہزادے
مہرالنسا کے ساتھ بے تکلف اور آزادانہ رہتے سہتے تھے، پردہ کی محلوں میں سخت
پابندی تھی لیکن مہرالنسا ابھی جوان نہ تھی جو اس پر پردہ کی قید لگائی جاتی [illegible]
شہزادوں کے ساتھ کھیلتی تھی، کھاتی پیتی تھی، بیٹھتی اٹھتی بھی تھی اور ان کے [illegible]
میں شریک بھی ہوتی تھی۔ شہزادے اسکی سلیقہ مندی اور متانت کیوجہ سے [illegible]
اپنی صحبت کے قابل سمجھتے تھے۔ اور یہ ہمیشہ انہیں کے ساتھ مشاغل علمی [illegible]
مصروف رہتی تھی اکثر شہزادہ سلیم سے جس کا لقب بعد میں جہانگیر ہوا۔ گفتگو [illegible]
تھی۔ اور یہ اُس کے سامنے بھی بے تکلف اور بے پردہ آتی جاتی تھی۔

شہزادہ سلیم اور مہرالنسا

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد   بسا کیں لذت از گفتار خیزد

یہ سب کچھ تھا کہ محل سرائے شاہی میں لڑکیوں کی عصمت و عفت کا بیحد خیال و
لحاظ رکھا جاتا تھا۔ مگر ایک محل میں ایک ہی قصر میں ہر وقت کا رہنا سہنا اُٹھنا
بیٹھنا مہرالنسا شہزادوں سے چھپ کر کہاں جاتی۔ اور ان کے ساتھ اکثر
مصروف سیر چمن بھی رہتی تھی پڑھتی تھی کھیلتی بھی تھی غرضکہ کسی قسم کی بیگانگی نہ تھی۔ ہاں
شہزادہ سلیم اکبر کا لاڈلا بیٹا اور شہزادوں کا پلا ہوا نور نظر تھا۔ اپنے آداب شہزادگی

اور وقار صاحبقرانی کو مد نظر رکھتے ہوئے بہت کم توجہ کے ساتھ مہرالنساء کیطرف دیکھتا تھا نہ مہرالنساء کے دلمیں کسی قسم کا خیال تھا جو شہزادے کو اپنی طرف توجہ کرے وہ بھی شاہی آداب کا لحاظ رکھتی تھی اور متانت و سنجیدگی کیساتھ پیش آتی تھی شہزادہ سلیم مہرالنساء کی تربیت و تعلیم تناسب خط و خال خوبصورتی اور لیاقت کی شہرت سے متاثر ضرور تھا مگر جسطرح چاند کے سامنے تاروں کی کتنی ہی تعریف ہو وہ اس سے متاثر نہیں ہوسکتا اسیطرح شہزادہ سلیم سب کچھ اُسکے متعلق سنتا تھا مگر اپنی قابلیت کے سامنے اور مہرالنساء کی لیاقت کا آفتاب دھندلا نظر آتا تھا۔ اور وہ اسکی طرف اُچٹتی ہوئی نگاہ ڈالکر اُسے بھلا دیتا تھا حسن اتفاق سے ایک روز شہزادہ سلیم چمن شاہی میں کبوتر اڑا رہا تھا اور مہرالنساء اپنی چند سہیلیوں کیساتھ اوس کے قریب مصروف گلگشت تھی شہزادے نے دو کبوتر مہرالنساء کو دیے اور کہا کہ انھیں اچھی طرح پکڑے رہو مہرالنساء نے حکم کی تعمیل کی اور شہزادہ اپنے کھیل میں مصروف ہوگیا تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ اتفاق سے ایک کبوتر مہرالنساء کے ہاتھ سے نکل گیا اور اوڑکر شاہی باغ میں خدا جانے کس طرف غائب ہوگیا شہزادہ جب اُسکی طرف رجوع ہوا اور کہا کہ میرے کبوتر لاؤ مہرالنساء نے کہا کہ صاحب عالم ایک کبوتر تو اُڑ گیا۔ ایک باقی ہے لیجئے شہزادہ نے دریافت کیا کہ ہائیں ایک کبوتر کیسے اُڑ گیا مہرالنساء نے دوسرا کبوتر بھی ہاتھ سے چھوڑ دیا اور کہنے لگی کہ حضور ایسے" نہ معلوم ان دو لفظوں میں یا ایک فقرے میں کس بلا کا جادو اثر تھا کہ شہزادہ سلیم بجائے خفا ہونیکے سکتہ کرکے رہ گیا اور اسی وقت سے مہرالنساء کی محبت نے شہزادہ سلیم کے دلمیں جگہ پیدا کرلی

اس واقعہ کو شیخ عاقل نے اپنی مثنوی میں اسطرح لکھا ہے ۔

کبوتر داد اور اشاہزادہ   بہ پروانہ کبوتر دل نہادہ

هر دو چوں چنگل شہباز دیده — نگہ چوں پنجۂ شاہیں رسیده
دگر چوں دیده دست آں ممتاز — کبوتر کرده بود از دست پرواز
بپرسیدش چه کردی آں کبوتر — بگفتہ رفت از دستم سراسر
دگر پرسید چوں رفتہ بگو باز — بگفتہ ایں چنیں کر دست پرواز
چنیں گفت و کبوتر دا د پرواز — ادائش لطف پیدا کرد با باز
کبوتر آں کہ در دست دگر بود — با وہم پیش او بگزاشت زود
چو آں شہ در ادائے دلبری دید — بتسم کرد و طرحش را پسندید
دل شہزاده را حسن و ادائش — بہم آموخت عشق فتنہ زائش

چونکہ شیخ عاقل کو کتب خانہ جہانگیری سے تعلق خصوصی تھا اسلئے اونکا یہ بیان کسی طرح غلط نہیں ہو سکتا اور واقعات مندرجہ تمام و کمال صحیح معلوم ہوتے ہیں غرضکہ اس طرح مہر النساء بیگم نے جہانگیر یا شہزاده سلیم کو اپنی خوش ادائی کی وجہ سے متوجہ کر لیا اور یہی بنیاد محبت تھی

مہر النساء چودہویں برس میں

اسی طرح رہتے سہتے مہر النساء کی عمر چوده سال کی ہو گئی اور مرزا غیاث اور اسکی بیوی نے محلات شاہی میں کافی رسوخ و اعتبار پیدا کر لیا وه لڑکی جسکا بچپن دوسری عورتوں کے شباب سے بہتر تھا شباب میں جو کچھ بھی ہو جائے کم ہے۔ ایک تو حسن لیاقت اوپر تقاضائے عمر اب تو مہر النساء اہل قلعہ کی نگاہوں میں پری بنکر پھرنے لگی جو اسکی طرف دیکھتا تھا اسکی نگاہیں مشکل واپس آتی تھیں حسن تقریر دلکشی تحریر متانت علم وقار حسن و جمال غرض ان سب نے ملجل کر مہر النساء کو چوٹی کی دلہن بنا دیا تھا۔ ان

باپ اپنی مہرجمال لڑکی کو دیکھتے تھے اور اسکے آغاز حیات پر نظر کرتے تھے تو عجیب طلسم
سا نظر آتا تھا وہ اپنے دلوں میں خیال کرتے تھے کہ یہ لڑکی آج محل شاہی میں دیکھنے کی
چیز بنی ہوئی ہے۔ ایک دن قندھار کے سنسان اور ہولناک جنگل میں بے مادر و پدر
تنہا پڑی ہوئی تھی کسے امید تھی کہ اسکا مستقبل اسقدر روشن ہوگا اور اس کی برکت
سے ہمارے دن پھر جائینگے۔ مہرالنساء کا یہ حال تھا کہ وہ تاریخ ایران، الف لیلہ،
عجائب المخلوقات، کلیلہ دمنہ، گلستان، بوستان، شاہنامہ، دیوان حافظ، انوار سہیلی
مینا بازار، یوسف زلیخا، سکندر نامہ، وغیرہ تمام فارسی کی سخت سے سخت کتابوں پر کافی
عبور حاصل کر چکی تھی۔ فن سپہ گری میں اوسکو پوری مہارت تھی۔ علم حدیث، فقہ،
حکمت کو دھو کر پی چکی تھی۔ اور مختلف فنون شریفہ و لطیفہ پر حاوی تھی۔ ہر موقع و محل
کے ہزاروں فارسی اشعار اوسے ازبر تھے اور وہ اپنے فضل و کمال کی وجہ سے ہر طرح
ملکہ بننے کے قابل ہو چکی تھی۔ سینے پرونے میں اس نے کافی دستگاہ حاصل کر لی تھی اور
اب حسن کا یہ عالم تھا کہ عصمت بانو اوسکی ماں اوسکے پردہ کا بہت زیادہ اہتمام رکھتی تھی
اور اسے کسی وقت اپنی آنکھوں سے اوجھل نہونے دیتی تھی وہ تیر نا خوب جانتی تھی۔
شکار گاہوں میں اوسنے معمولی طور اور غیر معمولی طور پر مشق بہم پہنچائی تھی۔ وضع اور طرز
میں جدت نگاری اسکی ذہانت کا ایک ادنیٰ کرشمہ تھی اوسنے گھوڑوں پر چڑھ کر شہسواری
بھی سیکھ لی تھی اور ہر قسم کے ہتھیاروں کی شناخت میں بھی اوسے ید طولیٰ حاصل تھا۔
اسکی وجہ یہ تھی کہ مرزا غیاث تمام شاہی کارخانوں کے مختار تھے۔ اس لئے ہر چیز
اوسکے سامنے آتی تھی اور وہ ہر چیز کی ماہیت کے دریافت کرنے میں اپنا ذہن صرف
کرتی رہتی تھی۔ اوسنے اپنی ایک خاص لائبریری قائم کر رکھی تھی جس میں وہ اکثر دن اور

رات میں زیادہ وقت صرف کرتی تھی اور کتابوں کے دیکھنے بھالنے سے اور کثرت مطالعہ سے اوسے ہزاروں نئی علمی باتیں معلوم ہوگئی تھیں - اوسنے اسی صغیر سنی میں شعر گوئی اور شعر فہمی میں بھی کافی قوت حاصل کرلی تھی اور کبھی کبھی خود ہی شعر بناتی اور اُسے خود ہی گنگناکر اُسکا مزہ لیتی رہتی تھی غرض یہ ہے کہ چودھویں برس میں مہرالنسار علم و فضیلت اور حسن و لیاقت کا ایک پورا چاند تھی جس پر اہل نظارہ کی نگاہیں محبت آمیز و قار و ادب کیساتھ پڑتی تھی اور شہزادہ سلیم کی توجہ میں روز نئے جذبات نئے اضطراب اور نئی بیقراری کا اضافہ ہوتا جاتا تھا -

پہلی شادی

شہزادہ سلیم کی محبت اور دلبستگی کا راز پوشیدہ نہ رہا - اور اوسکی متاہل نگاہوں سے شہنشاہ اکبر نے سب کچھ کہدیا - اکبر ایک زمانہ شناس، معاملہ فہم اور مآل اندیش بادشاہ تھا جب اُسنے شہزادہ سلیم کی للچائی ہوئی نگاہوں کو دیکھا اور کبوتر والا واقعہ سنا تو اوسکا ماتھا ٹھنکنے لگا اور وہ سوچنے لگا کہ کہیں شہزادی کی محبت اور توجہ کوئی نیا رنگ نہ لائے - وہ جانتا تھا کہ ہرچند مرزا غیاث میرا ملازم ہے اور میرے اختیار میں ہے - تاہم اوسکا تعلق ایران کی وزرات سے رہ چکا ہے اور اُسکی بی بی عصمت بانو ایران کے خاندان سے علم و اجتہاد سے وابستہ رہ چکی ہے اسلئے کہیں ایسا نہ ہو کہ شہزادے کی دلبستگی مہرالنسار کو خلعت زوجیت سے سرفراز کرکے کسی پولٹیکل خواہش کو ابھار دے اور شادی ہوجانے کے بعد مرزا غیاث کا ایرانی خاندان سلطنت مغلیہ پر قابض و مالک ہوجانیکا دعویٰ کر بیٹھے ان خیالات

متاثر ہو کر اس نے شہزادہ سلیم کو ایک دن تنہائی میں بلایا اور کہنے لگا کہ بادشاہوں کے محلوں میں جو شریف لڑکیاں رہتی ہیں ان کی نسبت شہزادوں کا خیال قابل اعتبار ہونا چاہیے۔ شہزادوں کو ہرگز لازم نہیں ہے کہ وہ محل میں رہنے والی لڑکیوں کو محبت اور خواہش کی نگاہ سے دیکھیں۔ ادھر تو اکبر نے پردہ ہی پردہ میں شہزادہ سلیم کے خیالات پر اُمید و بیم کا رنگ پھیرا اُدھر مرزا غیاث سے کہا کہ تمہاری لڑکی ہوشیار ہو گئی اس کی شادی کی کچھ فکر ہونا چاہیے۔ مرزا غیاث اور اُن کی بی بی نے دست بستہ عرض کی کہ حضور مالک ہیں حضور سکے ہوتے ہم کون ہیں کہ مہر النساء کی شادی کے متعلق کوئی رائے قائم کریں ہم بھی آپکے ہیں وہ بھی آپکی ہے جیسا حضور کے خیال میں مناسب ہو کیا جائے ہمیں چون و چرا کا اختیار نہیں ہے۔ حضور مختار ہیں جو چاہیں کریں شہنشاہ اکبر اچھی طرح سمجھتا تھا کہ مہر النساء کوئی لڑکی نہیں ہے جسکا ہاتھ بغیر سوچے سمجھے کسی کے ہاتھ میں دیدیا جائے۔ اس لئے اسکی نگاہیں اراکین سلطنت کے ہر فرد پر پڑتی تھیں اور واپس آجاتی تھیں۔ آخر اسکی نگاہ انتخاب علی قلی خان ترک پر پڑی اور اسکے وجود میں ایسے مہر النساء کے قابل جوہر نظر آنے لگے۔ علی قلی ترکی نسل کا ایک جوانمرد جنگجو سپاہی تھا وہ شہنشاہ اکبر کی ملازمت سے پہلے ایران میں شاہ طہماسپ صفوی کا سفرہ چین رہ چکا تھا۔ اور اب خان خاناں کے ذریعہ سے دربار اکبر میں ممتاز و سرفراز تھا اور اپنی بہادری و جوانمردی کا بار بار امتحان دے چکا تھا۔ دربار والے اسکی شجاعت و بسالت [illegible] کرتے تھے اور اکثر مہمات عظیم کے لئے اسی کو پیش کر دیا کرتے تھے چنانچہ علی قلی ایک مرتبہ کسی مست ہاتھی کے مقابلہ میں کھڑا کر دیا گیا۔ حاسدوں نے تو اسکی زندگی کو ختم کرنیکا منصوبہ اور سامان کیا تھا مگر خدا کو اسے جوانمرد ثابت کرنا

مقصود تھا۔ علی قلی نے ایک ہی ضرب میں اُس فیل مست کا کام تمام کر دیا اور دشمنوں
کے سامنے سرخرو ہوا۔ دوسری مرتبہ شیر سے مقابلہ کرا دیا اب بھی اوسنے شیر کو
للکار کے تلوار سے مار ڈالا۔ اور اس بہادری کے صلہ میں شہنشاہ اکبر نے اُسے
"شیر افگن" کا بہاورانہ اور قابل رشک خطاب دیکر اوس کے حاسدوں میں
اوسکا مرتبہ اور بھی دو بالا کر دیا۔ ان اوصاف سے متصف دیکھ کر اور اوس کی
قابلیت و جوانمردی پر اعتبار کر کے اکبر نے مہرالنسار کا نکاح شیر افگن خاں سے
پڑھوا دیا اور یہ نونہال گلزار کمال شیر افگن کی آغوش میں دیدی گئی ابتک تو
شیر افگن کے چند ہی حاسد تھے مگر اب اس تعلق نے اُسے شہزادہ سلیم کا حریف
و رقیب بھی بنا دیا سلطنت کی ملازمت پھر حریفوں کے مقابلہ بڑا سخت تھا۔
شیر افگن مست ہاتھیوں کو گرا سکتا تھا۔ بھوکے شیروں کو مار سکتا تھا لیکن حریفوں
اور حاسدوں سے مقابلہ کرنا اوسکے امکان سے باہر تھا مہرالنسار کی محبت نے
اوسکا دل کمزور کر دیا تھا اور وہ سمجھتا تھا کہ میں سب سے عہدہ برا ہو سکتا ہوں
لیکن شہزادہ سلیم کی طفلانہ ہٹیلی طبیعت کے جوش سے مقابلہ کرنا آسان
نہیں ہے۔ یہ سوچ کر وہ اپنی جاگیر بردوان میں بہ اجازت شاہی مقیم ہوا اور
وہاں مہرالنسار کے گلزار حسن سے بلا خوف صیاد بہ اطمینان گل چینی کرنے لگا۔
مہرالنسا کی ماں بھی اوسکے ساتھ تھی۔ اور یہ سب کے سب سکون و اطمینان
کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے۔

خاکستر عشق کا اشتعال

جب شہنشاہ اکبر کا پیمانۂ حیات لبریز ہوا۔ اور اوس نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا تو ۱۶۰۵ء میں عنان سلطنت شہزادہ سلیم نے اپنے ہاتھ میں لی اور اپنا لقب جہانگیر رکھا اب سے ہم بھی شہزادہ سلیم کو جہانگیر ہی کے نام سے مخاطب کریں گے۔ تخت پر بیٹھتے ہی جب انصرام امور سلطنت سے فراغت حاصل ہوئی۔ اور تمام سلطنت اچھی طرح قابو میں آگئی تو جہانگیر کے دل میں عشق مہرالنساء کی جو چنگاریاں دبی ہوئی تھیں ایک دم سے بھڑک اٹھیں ان کا سوز اوس کے دل میں چمک پیدا کرنے لگا۔ اور یہ مہرالنساء کو حاصل کرنے کی تدبیروں میں مصروف ہوا ایام جوانی پھر شہنشاہی و صاحبقرانی، حکومت بھی موجود طاقت بھی بسر اور سب پر مستزاد عشق نہفتہ۔ بھلا اب کون تھا جو اس کے بڑھتے ہوئے جوش کو روکتا اور رکی ہوئی طبیعت کو ابھرنے سے باز رکھتا اُسکا جوش محبت یکدم بڑھا۔ اور سیلاب انتقام کی صورت اختیار کرنے لگا وہ شیر افگن کی بہادری اور جنگجوئی سے واقف نہ تھا۔ اسلئے سوچنے لگا کہ کوئی ایسی تدبیر ڈھونڈی جائے کہ ہلدی لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آئے۔ سوچتے سوچتے اوس نے ایک تدبیر سوچی اپنے رضائی بھائی قطب الدین کو کلتاش بلا کر اپنے جذبات دلی کا اظہار کیا۔ اور اسے اپنا ہمراز بنا کر بنگالہ کو صوبہ دار مقرر کیا۔ اوسے تاکید اکید کیگئی کہ بنگال میں پہنچتے ہی شیر افگن سے مہرالنساء کو طلاق دلوانے کی کوشش کرے اور اگر وہ طلاق نہ دے تو اسے قتل کر کے مہرالنساء کو دارالسلطنت میں بحفاظت پہنچا دے

ادہر تو قطب الدین کوکلتاش بنگالہ کی صوبہ داری پر مامور ہوکر آگرہ سے چلا اُدہر
شیر افگن خاں کے وکیل نے جو دربار جہانگیری میں ہر وقت حاضر رہتا تہا اس واقعہ
کی خبر شیر افگن کو پہنچائی شیر افگن خاں فوراً تاڑ گیا کہ اس جدید تقرر سے جہانگیر
کا مطلب کیا ہے اور اس کی تہ میں وہ کسقدر گہرا کام کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ ان
خیالات سے متاثر ہوکر اوسنے فوراً اپنی ملازمت کو استعفا دیدیا اور اس سے پہلے
کہ قطب الدین بنگالہ میں اپنی صوبہ داری کا جھنڈا گاڑے اُسنے سپاہیانہ لباس اور
اسلحہ وغیرہ سب اپنے جسم سے دور کرکے اپنی آزادی کا اعلان کردیا شیر افگن
جہانگیر کے چوٹی رقابت کا مقابلہ مردانہ وار کرنا چاہتا تہا اوسکے پہلو میں ایک غیور
دل تہا۔ وہ مہر النسا کی محبت پر شاہی ملازمت کو ترجیح دینا پسند نہ کرتا تہا۔ اور وہ
سمجھتا تہا کہ میں سنہری چڑیا کو گلزار جہانگیری سے اُڑا کر لایا ہوں اُسکے دوبارہ
پہانسنے اور صید کرنے کے لئے جہہ پہاپیاں ضرور توڑی جائینگی واسطے اوسنے
یہی بہتر سمجھا کہ تعلقات خاندانہ سے کنارہ کش ہوکر اپنی محبت کی حمایت مردانہ
کرے اور حتی الامکان جہانگیر کی رقابت کو بار آور ہونے دے قطب الدین نے
بنگالہ پہنچتے ہی شیر افگن کے نام حاضری کا حکمنامہ بہیجا مگر اب شیر افگن شاہی ملازم
نہ تہا کہ قطب الدین کا حکم پاتے ہی سر تسلیم خم کرکے روانہ ہوجاتا اوسنے اوسکے
متواتر احکام کی بہی کچھ پرواہ نہ کی اور آسودگی و یکسوئی کے ساتھ اپنی جاگیر
بردوان میں خاموش بیٹھا رہا قطب الدین جس کام کے لئے مامور ہوا تہا ابہی وہ
کام باقی تہا اسلئے آسنے خود بردوان کی راہ لی اور بحیثیت ایک صوبہ دار کے نہیں
بلکہ ایک دوست کے شیر افگن کو پیام ملاقات بہیجا شیر افگن اب بہی اوس سے نہ ملتا

مگر اوسکی شجاعت و بسالت نے قطب الدین سے نہ ملنے پست ہمتی سے تعبیر
کیا اور گھر میں عورتوں کی طرح چھپ کر بیٹھ جانا اُسے پسند نہ آیا - وہ اٹھا ایک
بکتر اور اسکے اوپر لمبی آستینوں کا پوستین پہنا - ایک زہر میں بجھی ہوئی تلوار
آستین میں چھپائی اور چند ہمراہیوں کی معیت میں شیروں کیطرح رقیب جہانگیر
کے بھائی سے ملنے کے لئے بیباکانہ چلا - جب شیر افگن قطب الدین کے خیمہ
میں پہنچا تو اوسکا بڑے تپاک اور گرمجوشی کیساتھ قطب الدین نے استقبال
کیا - بٹھایا مزاج پوچھا اور کہنے لگا کہ شیر افگن یہ تم جانتے ہو کہ شہنشاہ
جہانگیر کو مہر النسا سے بچپن کی محبت ہے وہ اسکے ساتھ کھیلے ہیں اور آنکے
تیر عشق سے اون کا دل ہدف ہو چکا ہے اسلئے اب مناسب یہی ہے
کہ تم اوسے طلاق دیدو اور شہنشاہ جہانگیر سے خلعت و ریاست حاصل
کرو - وہ تمہیں اتنا کچھ عنایت فرمائیں گے کہ تم مہر النسا جیسی دس عورتیں
اپنے نکاح میں لا سکتے ہو - شیر افگن نے تیور بدلیا [illegible] کر
قطب الدین کی یہ گفتگو اوسکے [illegible] مگر
وہ کمزور نہ تھا جو فوراً بھڑک اٹھتا اوسنے بہسانی ہنسی سے قطب الدین کی مہربانیا
کا جواب [illegible] آخر میں صاف کہا کہ جہاں پناہ کسی کی منکوحہ
عورت پر [illegible] کے مجاز نہیں ہیں یہاں تو یہ باتیں ہو رہی تھیں فی الحال
دروازہ پر شیر افگن کے ہمراہی گرفتار کئے جانے لگے اونکی آوازیں اوسنے سُنیں
شیر افگن بپھرا اور قطب الدین سے کھڑا ہو کر کہنے لگا کہ میرے آدمی کس جرم
میں گرفتار کئے جا رہے ہیں یہ کیا نامردانہ واقعات ہیں کیا مجھے دھوکا دیا

جا رہا ہے۔ قطب الدین اسی اثنا میں چاہتا تھا کہ شیر افگن کی بدحواسی کا جواب خنجر سے دے کہ شیر افگن نے پھرتی کیسا تھ آستین سے تلوار نکالی اور اس زور سے قطب الدین کی پیٹھ میں ماری کہ اوسکی آنتیں نکل پڑیں اور وہ سرنگوں ہو کر ذرا سی دیر میں وہیں ڈھیر ہو گیا۔ قطب الدین نے جن لوگوں کو شیر افگن کے قتل کرنے کے لئے پہلے ہی سے چھپا رکھا تھا۔ وہ چاروں طرف سے دوڑ پڑے ایک آدمی اتنے مسلح سپاہیوں پر کیونکر غالب آتا۔ آخر ایک کشمیری کے ہاتھ سے شیر افگن زخمی ہو کر گر پڑا اور پھر جانبر نہ ہو سکا تزک جہانگیری میں اس واقعہ کو جہانگیر نے اپنے قلم سے اسطرح تحریر کیا ہے "علی قلی استاجلو کہ سفرچی شاہ اسمعیل والی ایران بود بعد از فوت بنا بر شرارت و فتنہ انگیزی کہ در طبیعت داشت بگریختہ بقندہار آمد در ملتان ملازم خان خاناں شد خان خاناں او را داخل بندہا ساخت بموش آشنائی ساخت۔ در سفرے در خدمت والد بزرگوارم بود در ایامیکہ خود بدولت متوجہ ولایت دکن شدند و مرا بہ سر رانا تعین فرمودہ آمدہ نوکر من شد او را بخطاب شیر افگنی سرفراز ساختم۔ چون از الہ آباد بخدمت والد بزرگوارم آمدم بنا بر نا اتفاقی کہ نسبت من بظہور رسید اکثر ملازم و مردم من متفرق شدند۔ او ہم دریں وقت از خدمت جدائی اختیار نمود بعد از جلوس از روے مروت تقصیرات او در نظر نیاوردہ در صوبہ بنگالہ حاکم جاگیر کردم ازانجا اخبار رسید کہ امثال من فتنہ جویاں را دریں ولایت گذاشتن [illegible] نیست بقطب الدین خان حکم رفت کہ او را بدرگاہ فرستد و اگر خیال [illegible] و باطل کند بسزا رساند۔ خان مشار الیہ او را بواجبی مے شناخت با مر [illegible]

کہ حاضر بودند بمجرد رسیدن حکم بہ دوان کہ جہانگیر او بود یلغار نمودہ۔ علی قلی خان چوں از رسیدن قطب الدین خان خبردار شد تنہا با دو جلودار باستقبال او متوجہ گردید بعد از رسیدن دو آدن میاں فتح خان مشارالیہ مردم او را فرو میگیرند۔ او چوں فی الجملہ ازیں روش قطب الدین خان بہ مظنہ شدہ بود از روے فریب میگوید کہ ایں چہ روش تو بہ گشت۔ خان نوکر مردمان را منع کردہ تنہا با او ہمراہ مے شود کہ مضمون حکم با خاطر نشان سازد۔ دریں وقت فرصت جستہ فی الفور شمشیر کشیدہ دو سہ زخم کاری با دمیر ساند چوں انبہ خان کشمیری از حاکم زادہ ہائے کشمیر بود بخان مشارالیہ نسبت و محبت تمام داشت از روئے حلال نمکی و مردانگی خود را رسانیدہ زخم کاری بر سر علی قلی زد و ایں متفنی شمشیر با انبہ خان زدہ زخمش کاری افتاد چوں قطب الدین خان را بایں حالت دیدند۔ مردم ہجوم آوردہ او را پارہ پارہ ساختند و بجہنم فرستادند۔ امید کہ ہمیشہ در جہنم جائے آں بدبخت درد سیاہ بودہ شد۔ انبہ خان ہماں جا شہادت یافت۔ و قطب الدین خان کو بعد از چار پہر در منزل خود برحمت ایزدی پیوست۔

اپنے تحریری بیان میں جہانگیر نے مہر النسا کا ذکر کہیں نہیں کیا ہے۔ بلکہ شیر افگن کے قتل کو پولٹیکل وجہ سے وابستہ کیا ہے لیکن عام مورخوں کا اتفاق ہے کہ جہانگیر نے شیر افگن خان کو صرف جوش رقابت سے مجبور ہو کر قتل کرایا۔ اور اپنے دلی بغض اور غیظ کا انتقام اس طرح لیا

مہرالنساء جہانگیر کے اختیار میں

"پرائے بس میں پڑ کر قہر ہے مجبور ہو جانا"

قطب الدین کوکلتاش اور شیر افگن کا قتل کوئی معمولی قتل نہ تھا۔ سارے بنگالہ میں ہل چل مچ گئی۔ بردوان میں قیامت سی بپا ہوگئی عصمت بانو والدہ مہرالنساء کو جب شیر افگن کے قتل کی خبر پہنچی۔ تو وہ سمجھ گئی کہ اوسکی اور اسکی لڑکی مہرالنساء کی قسمت اب ایک اور پلٹا لینے والی ہے مہرالنساء اپنی چھوٹی سی لڑکی کو چھاتی سے لگائے ہوئے (جو شیر افگن کے صلب سے تھی) ایک کونہ میں بیٹھی ہوئی رو رہی تھی اوسے فی الحقیقت شیر افگن سے محبت تھی اور وہ اُسے دل سے چاہتی تھی۔ اسلئے بے اختیاری کی حالت میں [illegible] آنسوؤں سے چشمہ زار بنا ہوا تھا اور آنکھیں روتے روتے سرخ ہو [illegible] یہ حال دیکھکر عصمت بانو بیگم نے اُسے سمجھایا کہ لڑکی دیوانی ہوئی [illegible] تجھے ابھی زندگی میں خدا جانے کتنے انقلاب دیکھنے ہیں۔ یہ تو تیری زندگی کا پہلا سانحہ ہے عقلمند اور تعلیم یافتہ ہوکر اسقدر دل چھوٹا کرنا اور انجام کار پر نظر نہ ڈالنا تیری ذات سے متوقع نہیں ہے۔ صبر کر اور دیکھ کہ وہ خدا جس نے تیری لق و دق سنسان میدانوں میں مدد کی تھی اس جگہ بھی وہ رہی سکے عالم پیدا کیا گیا ہے ادھر بردوان کے چند با اثر لوگوں نے اپنی سرخروئی کیلئے سوچا کہ شاہی احکام سے پہلے مہرالنساء اور اوسکی والدہ کو جلد از جلد آگرہ پہنچا دیا جاوے تو مراحم خسروانہ کا باعث ہوگا۔ یہ سوچ کر چند لوگ

عصمت بانو بیگم کے پاس آ گئے وہ اپنے دل میں پہلے ہی سے تہیہ کئے بیٹھی
تھی۔ فوراً اپنی بیٹی اور نواسی کو لیکر آگرہ کی طرف اون لوگوں کیساتھ روانہ ہوگئی
ادہر تو یہ سوگوار قافلہ آگرہ پہنچا ادہر شہنشاہ جہانگیر کا حکم حاکم بردوان کو
پہنچا کہ مہر النسا اور اوسکی ماں کو فوراً آگرہ کی طرف روانہ کردو۔ اس کے
جواب میں اوسنے لکھ بھیجا کہ وہ قبل صدور حکم آپکی طرف بعزت و احترام
روانہ کر دی گئیں جب مہر النساء اپنی ماں کے ساتھ آگرہ پہنچی اور شاہی محلوں
میں آئی تو دوسرے دن جہانگیر نے اوسکا عندیہ لیا اور ایک خادمہ کے ذریعہ
سے دریافت کروایا کہ اب اوسکا اپنی آیندہ زندگی کے متعلق کیا خیال ہے۔
مہر النسا نے صاف کہلا بھیجا کہ میں تو آیندہ زندگی بیوگی میں اپنی عمر کاٹنا پسند
کرتی ہوں اور ایسا ہی کروں گی بھی۔ مہر النساء کا یہ جواب صاف جب جہانگیر
نے سنا تو وہ کچھ زیادہ پریشان نہیں ہوا اور سمجھا کہ شیر افگن کی موت کا زخم ابھی
اوسکے دل پر تازہ ہے۔ رفتہ رفتہ جب اندمال پذیر ہوگا تو پھر دیکھا جائیگا
یہ سوچ کر اوس نے سلطانہ سلیمہ بیگم زوجہ حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ
کو بلا کر مہر النساء کو ان کے حوالے کر دیا کہ وہ اپنے مرحوم بیٹے قطب الدین
کوکلتاش کا اس کو معاوضہ سمجھے۔ سلطانہ سلیمہ بیگم کچھ نادان تو تھیں
جو جہانگیر کے اس رمز کو نہ پہچانتیں وہ سمجھ گئیں کہ مہر النساء کی حوالگی
شہنشاہ کا کیا مطلب ہے دو برس کی متواتر صحبت اور یکجائی نے مہر النسا
کی طبیعت کو بہت کچھ جہانگیر کیطرف مائل کر دیا۔ جیسا کہ ان روایتوں سے
ظاہر ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ مہر النساء نے ایک گلدستہ نرگس کا تیار کرکے

بادشاہ کے دربار میں بھیجا اور اسی کے ساتھ یہ مصرعہ بھی لکھ کر نذر کیا ع

نیست نرگس چشم قدرت کردشوق روئے تو

اسکے جواب میں جہانگیر نے یہ مصرع لکھا۔

مصرع

کاش باشد نور ہم در نرگس دجوئے تو

چونکہ شہنشاہ جہانگیر کا نام "نورالدین" تھا اسلئے اس مصرع میں لفظ نور ہم جو معنی پیدا کرتا ہے وہ محتاج تشریح نہیں۔ اس مصرع کے جواب میں مہرالنسا نے یہ شعر لکھ کر بھیجدیا۔

شعر

نور را در چشم از روز ازل جا دادہ اند

ہیچ اندر پردہ با پنہاں جمال روئے تو

مہرالنساکی شادی جہانگیر سے

جب اس حالت میں مہرالنساء کو سلطانہ سلیمہ بیگم کی نظربندی میں رہتے رہتے بہت زیادہ عرصہ گزر گیا۔ تو مہرالنساء کو سلطانہ موصوفہ نے بہت کچھ اونچ نیچ سمجھا بجھا کر نکاح ثانی کی طرف راغب کیا اور اوسکی سہیلیاں اور حیات النساء بیگم وغیرہ مہرالنساکو ہر وقت ترغیب دیتی رہتی ہیں۔ ادھر شہنشاہ جہانگیر نے مہرالنساء کے باپ اور بھائیوں کے مناصب بڑھانے کیطرف توجہ کردی۔ غرضکہ باحسن الوجوہ جہانگیر کی محبت اور توجہ نے مہرالنسا کے دل کو موم کرہی لیا۔ ایک دن موقعہ پاکر سلطانہ سلیمہ بیگم نے مہرالنساء کو شہنشاہ

جہانگیر کے سامنے لاکر کھڑا کر دیا۔ آنکھوں کا چار ہونا تھا کہ ایک تیر عشق ادھر تو کلیجہ کے پار ہو گیا۔ ادھر مہر النساء کی نگاہیں بھی جھک گئیں۔ سلطانہ نے اسکی عصمت و عفت، بردباری، تحمل، اور ضبط شباب کی کیفیت حضور بادشاہ میں عرض کی پہلا اب جہانگیر کو تاب ضبط کہاں تھی، چنانچہ اپنے سال جلوس کے چھٹے سال یعنی ۱۰۲۰ھ میں جہانگیر نے بڑے تزک و احتشام اور شاہانہ جلوس کے ساتھ مہر النساء سے شادی کر لی اور مہر النساء کو "نور محل" اور "نور جہاں" کے روشن خطاب حضور شاہ سے عطا ہوئے۔ نور جہاں کی ایک مہر علیحدہ بنی جسمیں کندہ تھا ؎

نور جہاں گشت بفضل اللہ ہمدم و ہمراز جہانگیر شاہ

نور جہاں کی شاہانہ زندگی پر ایک نظر

جب نور جہاں بادشاہ بیگم ہوئی اور اُسے نور الدین جہانگیر بادشاہ ہندوستان کی ملکہ بننے کا فخر حاصل ہوا تو اوس نے اپنی پوری لیاقت و دانائی کے ساتھ بادشاہ کی نگاہوں میں اپنا اعتبار اور اسکے دل میں اپنا وقار قایم کر لیا۔ وہ عدالت کے وقت پردہ میں اپنے شوہر کے ہمراہ بیٹھتی اور مقدمات سنتی اور اُن کا فیصلہ اون کی رائے سے ہوتا۔ ہر مہم سے مہم اور نازک سے نازک معاملہ کو اس خوبی اور انصاف کے ساتھ سلجھاتی کہ بڑے بڑے مدبران سلطنت دانتوں میں انگلیاں داب کر رہجاتے فرامین شاہی کی پیشانیوں پر یہ عبارت بھی لکھی جانے لگی

بحکم علیہ عالیہ مہد علیا نور جہاں بادشاہ

سکہ رائج الوقت میں بھی اوسکا نام شہنشاہ جہانگیر کے ساتھ مسلوک ہونے لگا
اور یہ عبارت کندہ ہونے لگی۔

بحکم شاہ جہانگیر یافت صد زیور — بنام نورجہاں بادشاہ بیگم زر

وہ نہ صرف معدلت گستری اور عدل آرائی میں بادشاہ کا ساتھ دیتی تھی اور اسکی مشیر
خاص تھی بلکہ اُسکی تفریحوں میں بھی اُسکا ساتھ دیتی تھی چنانچہ شکار گاہوں میں
وہ اُسکے ساتھ ہاتھی پر بیٹھکر جاتی اور شیروں کو تیروں سے شکار کرتی [illegible]
پھرتی اور چابکدستی کیساتھ کہ بعض اوقات جہانگیر بھی منہ دیکھتا رہ جاتا [illegible]
چنانچہ ایک روز شہنشاہ جہانگیر اپنی بیگم یعنی نورجہاں کے شکار کو گیا جنگل
میں چار شیر گھیر کر لائے گئے۔ نورجہاں نے کہا کہ میں گولی لگاؤں گی۔ بادشاہ
نے مسکرا کر کہا تم عورت ہو شیر کا شکار مردوں کا کام ہے۔ یہ الفاظ [illegible] اوگا
کے منہ سے نکلے ہی تھے کہ نورجہاں کی بندوق سے گولی نکلی اور [illegible]
کرکے چاروں شیروں کو چت کردیا۔ نورجہاں اپنی اس چابکدستی اور پھرتی سے
خود بھڑک اُٹھی اور اُس کی زبان سے بے ساختہ یہ ذومعنی شعر نکل گیا۔

نورجہاں اگرچہ بصورت زن است — در صف مرداں زن شیر افگن است

اگرچہ مصرع ثانی میں زن شیر افگن کے ایہام سے جہانگیر چونکا لیکن چونکہ
نورجہاں نے حقیقت میں اوسوقت شیروں کو مار کر گرا یا تھا کچھ نہ کہہ سکا اور
اپنے گذشتہ دغا دہی یاد کرکے نادم ہوکر رہ گیا۔ شکار میں اسقدر مشق پیدا
کرنے کی وجہ نہ صرف وہ ابتدائی مشق و تعلیم تھی جس نے نورجہاں کو فنون
سپہ گری سے ایک حد تک واقف کار بنا دیا تھا بلکہ شیر افگن جیسے دلیر و دلاور

اور جنگجو بہادر کی معیت و صحبت نے اسے ان کاموں کا ذاتی تجربہ
بھی کرا دیا تھا۔ اور بردوان کے جنگلوں میں وہ اکثر اپنے شوہر کے ساتھ شیر دل
کا شکار کھیلا کرتی تھی۔ نورجہاں کی زندگی چونکہ شروع سے شاہانہ زندگی
کے دوش بدوش رہی، اور اوس کے خمیر میں شاہی خو بو خاندانی طور پر موجود
تھی اس لئے اب جہانگیر کے حرم میں داخل ہو جانے کے بعد اوسے کسی قسم کے
تصنع اور بناوٹ سے کام لینے کی ضرورت نہ پڑی بلکہ اوسکی ہر ادا اور ہر وضع
شاہی اطوار و اخلاق کا بنا بنایا نمونہ تھی

مذہب

نورجہاں مذہباً تو مسلمان تھی مگر عقائد کی رو سے وہ بڑی پکی شیعہ تھی اور
شیعیت ہی کا اثر تھا کہ ایران سے بڑے بڑے شیعہ مجتہد اور علما جہانگیر کے دربار
میں بلائے گئے تھے اور بہت سے شیعہ فضلا خود نورجہاں کی خدمت میں مامور تھے
تھے۔ وہ مجالس محرم شریف اور چہلم میں ہزاروں روپیہ صرف کر دیتی تھی اور
اونہیں بارونق بنانے میں کوشش کرتی تھی۔ اکثر مسلموں کو ہر سال مکہ معظمہ
حج کے لئے اور مدینہ منورہ، نجف اشرف، کربلائے معلی، مشہد مقدس وغیرہ وغیرہ مقامات
میں بغرض زیارت اپنے صرف سے بھجواتی تھی۔ حضرت قاضی نور اللہ شستری
بھی جنکا مزار آگرہ میں دیوانی کچہری کے پاس واقع ہے اور جو اہل التشیعہ میں ایک
بہت بڑے مجتہد بزرگ تھے۔ نورجہان کے ایما ہی سے یہاں ایران سے
تشریف لائے تھے اور ایسے ایسے بیسیوں صاحب کمال اوسکے دامن دولت
سے وابستہ تھے جنکو ہزاروں روپیہ ماہانہ وظیفہ ملتا تھا۔ اور انکا احترام بادشاہ خود بھی

کرتا تھا۔ گو جہانگیر اور جہانگیر کا سارا دربار سنی تھا۔ مگر ایک نورجہاں کے شیعہ ہونے سے
اسکے دربار میں ہی شیعیت کا رنگ چھڑک رکھا تھا۔ اوسنے مقدس مقامات کے
تبرکات جمع کر لئے تھے۔ جو ایک خاص جگہ بصد احترام رکھے گئے تھے۔ خاص مواقع پر
نورجہاں اون تحایف کی زیارت کیا کرتی تھی نورجہاں کے حکم و ایما سے بہت سے
شیعہ مدبر ارکین سلطنت میں بھی داخل کر لئے گئے تھے۔

عفت نورجہاں

اسمیں شک نہیں کہ مسلمان سر برآرایان سلطنت کے محلوں میں پردہ کا نہایت
موزوں انتظام رہا کرتا تھا اور مردوں اور عورتوں کے اخلاق میں تہذیب کی
جھلک بہت زیادہ نظر آتی تھی تاہم نورجہاں کی عفت کو شی قابل داد تحسین ہے
کہ چودہ برس تک حرم شاہی میں رہی لیکن اپنی عفت کو للچائی ہوئی نگاہ سے بچایا
عیش و عشرت کی بادشاہ کدوں میں کیا کمی تھی دنیا کے جذبات انگیز سامان
ہر وقت نگاہوں کے سامنے رہتے تھے اور گو وہ اس عمر تک کیفیت شباب کی لذت آ
شنا نہ تھی تاہم کتابوں کے دیکھنے اور دن رات کے مطالعہ سے اوس پر یہ اچھی طرح
ظاہر تھا کہ جوانی کی کیفیت کو مردانہ ہاتھوں کے جسکی ضرورت ہے۔ پھر بھی تمام
شاہزادگان قلعہ سے اوسنے اپنی عفت کو محفوظ رکھا اور کبھی اسکو چہ میں قدم نہ رکھا
جس میں ہر ہر قدم پر رسوائی اور ذلت کے کنوئیں موجود ہوتے ہیں۔ وہ جہانگیر کی
نگاہوں میں جگہہ پانے سے پہلے صرف عورت تھی اور صرف عورت ہونا بہت ممکن
تھا کہ اسکو غلط راستہ پر لگا کر طمع اور حرص و ہوا کا بندہ بنا دے مگر شرافت نفس

نے اوسے عزت نفس پر مجبور کر رکہا تہا اور وہ عابدہ اور زاہدہ لڑکیوں کی طرح اپنی عفت وعصمت کی نگاہداشت میں بہت زیادہ توجہ گذار رہتی تہی۔ اسکی عفت کوشی اور عصمت اندوزی کا امتحان خدا نے اسوقت بہی لیا جبکہ وہ شیر افگن خان کے مرنیکے بعد شاہی نظربند ہوکر سلطانہ سلیمہ بیگم کے گہر میں رہی اب وہ لذت شباب اور کیفیات جوانی سے لذت آشنا ہوچکی تہی اور شیر افگن کی گرمجوشانہ صحبتوں نے اوسکے جذبات کو نسیم کے ساتھ ابہار دیا تھا۔ بہت ممکن تہا کہ وہ یہاں آتے ہی جہانگیر کے محلوں میں اوسکے ایما وتمنا کے موافق داخل ہوجاتی۔ یا دیگر شاہزادگان شاہی وارکین سلطنت میں سے کسی کو اپنے قابل سمجھ لیتی مگر واہ رے عصمت کہ نورجہاں نے کامل دو سال صبر وتحمل میں کاٹ دیے۔ اور زبان سے کیا اشارتاً وکنایتاً بہی اپنے جذبات کی پراگندگی وہیجان کا اظہار نہ کیا اس عرصہ میں برسات بہی آئی جاڑے بہی آئے گرمیاں بہی آئیں بہاروں نے دنیا کے باغوں میں جہولے بہ ڈلے جہولوں میں مستانہ پینگیں بہی پڑیں مجلس شاہی میں نغمہ سرایاں بہی ہوئیں نا کتخدا لڑکیوں کے بیاہ بہی ہوئے مگر یہ غریب عصمت کی دیوی صبر وضبط کئے ہوئے دو برس تک خاموش ہی بیٹھی رہی۔ اس زمانہ سکونت میں جہانگیر نے اوسے قابو میں لانے اور اپنی ملکہ بنانے کی سیکڑوں کوششیں کیں لیکن نورجہاں کی عفت نے اون سب کو ناکام رکہا یہی وجہ تہی کہ جہانگیر کے دل میں نورجہاں کی محبت روزافزوں ترقی کرتی جاتی تہی اور وہ جسقدر اغماض کرتی تہی اتنی ہی آتش شوق تیز ہوتی تہی اور وہ جسقدر اوسکا خاندانی ورثہ تہی اوسکی ماں کا نام عصمت النسا بیگم تہا جس نے اُسے طفلی ہی سے عصمت کا سبق حفظ کرا دیا تہا اور جسکی نگرانی اوسکی عصمت عفت

کو محفوظ رکھنے کیلئے گویا ایک خاص سبب تھی جسنے نورجہاں کو معصوم رہنے میں بہت زیادہ مدد کی

نور محل

قلعہ شاہی میں نورجہاں کو ایک خاص محل دیدیا گیا جسکا نام نور محل تھا اس محل کو
زیبائش دینے اور سجانے میں ہر ممکن کوشش کی گئی تھی اور گویا یہ کوئی خاص امتیاز
دوسرے محلوں سے نہیں رکھا تھا تاہم نورجہاں کی جدت پسندیوں نے اسکے در و
دیوار کو روشن فروش بنا رکھا تھا۔ تمام محل کی عورتیں اور کنیزیں ہر وقت انتظار
تہذیب و ترصیع میں لگی رہتی تھیں۔ صفائی کا یہ عالم تھا کہ نگاہیں پڑنے سے
بھی فرش میلا تھا۔ محل کے کئی حصے تھے مثلاً پھول محل گلکدہ سوسن منزل،
لالہ چہرہ وغیرہ وغیرہ خلوت کدہ خاص میں روز خوشرنگ اور خوشبودار تازہ پھول
منوں صرف ہوتے تھے۔ پھولوں سے قسم قسم کی گلکاریاں کی جاتی [illegible]
بنائی جاتی تھیں۔ کلیوں سے دروازے کے پردے بنائے جاتے تھے اور پھر ان
پھر کلیاں اسطرح چنی جاتی تھیں کہ اگر شمع گل کر دی جائے تو یہ معلوم ہو کہ
چاندنی چھٹکی ہوئی ہے ہزاروں قسم کے فانوس اور قد آدم آئینے سے سجائے جاتے
تھے۔ فانوسوں میں رات کو ہزاروں قسم کی روشنی ہوتی تھی۔ دیواروں پر جو سنہری
بیل بوٹے صناعان عجم و ہند کی اعلیٰ دستکاریوں سے بنائے گئے تھے وہ اس
روشنی میں ایسے بے نظیر اور لاجواب معلوم ہوتے تھے کہ دیکھنے والے کی نگاہیں
حیران رہ جاتی تھیں اور یکایک چکا چوند سی پیدا ہو جاتی تھی۔ آہ آج کوئی اس بہشت
پیکر نور محل کو دیکھے نہ وہ سامان ہیں نہ وہ گلکاریاں ہیں۔ فانوس اور آئینے

تو خیر عہد سلطنت کی نمائشوں کے ساتھ ساتھ گئے۔ مگر در و دیوار کے نقوش رنگین
بھی خاک میں ملے ہوئے پڑے ہیں، جہاں نورجہاں کلیوں کی سیجوں پر خواب ناز
میں مصروف ہوتی تھی وہاں ابابیلوں اور چمگادڑوں نے اپنے آشیانے بنالئے
ہیں جہاں عطر کے قربے اور گلاب کے شیشے دن رات کھلے رہتے تھے وہاں
اب بغیر ناک بند کئے جانا مشکل ہے جہاں رات کو بھی صبح فردوس کا عالم رہتا تھا
وہاں آج دن کو شب دیجور کی سی تاریکی چھپی ہوئی ہے۔ آہ! مکڑیوں سے کون کہے
کہ جن دیواروں پر تم نے جالا تنا ہے یہ دیواریں نورجہاں کے رخسار رنگیں کا آئینہ ہیں۔
انہیں اُسکے حسن عالمتاب کی یادگار رہنے دو، انکونوں میں تم اپنا سفید جال نہ
بچھاؤ جنہیں اوس کے پھولوں کی مہک برسوں رہی ہے۔ افسوس! ابابیلو
چمگادڑو [illegible] سمجھا سکے کہ جن مقامات پر تم بیٹ او مینگنیاں پھیلا رہی ہو
وہاں [illegible] یہاں اپنا جڑاؤ زیور رکھتی تھی۔ اور یہاں اوسکا فرش خواب بچھتا تھا
یہاں وہ [illegible]تی تھی، یہاں وہ بیٹھتی تھی، اور یہاں اپنے عطر آگین جسم نازک سے
نور اور سرور کی کرنیں ڈالا کرتی تھی۔ آہ انقلاب نے اُن تمام آرائشوں کو خاک
میں ملا دیا۔ اگر نورجہاں اب پیدا ہو اور قلعہ میں آکر اپنے محلوں کی حالت زار
دیکھے تو اوسکو کبھی یقین نہ آئے کہ ایک دن یہ اُجڑے ہوئے ویرانے اوسکے
برکت اندوز قدموں سے آباد تھے اور وہ یہیں دلوں پر حکومت و شاہی کرتی تھی

کیسا اورنگ شہی کیسا شکوہ سلطنت — کیسا ایوان مرصع کیسا قصر دلربا
سیر کے قابل نہیں دنیا کا کوئی سین آہ — ہے تماشہ گاہ ہستی بھی عجیب عبرت سرا
کون چھین کر لیگیا وہ پھول اس گلزار سے — چار دن کلیوں کے ہنسکر دل جو بہلایا تو کیا

کیسا جیغہ کیسا طرہ کیسی کلغی کیسا تاج — تخت شاہی پھر کہاں جب آگئی سر پر قضا
لیگیا سر پر اٹھا کر افسر و اورنگ کون — چل بسے دار فنا سے سینکڑوں فرمانروا
وہ ملوک ہفت کشور وہ شہ والا نژاد — جن کی نصرت کا علم لہرا رہا تھا جا بجا
کانپتے تھے جن کی صورت سے زمین آسمان — جنکی سطوت دیکھکر شیر دلوں کا زہرہ آب تھا
جنکے در پہ بج رہا تھا روز و شب کوس ظفر — جنکے سر پر تھا ہما اقبال کا سایہ کئے رہا
ہاتھ آیا ہستی فانی سے کچھ بھی وقت مرگ — لیگئے دنیا سے کچھ بھی پاس حسرت کے سوا
ہیں یہ سب دنیا کے جھگڑے دور غافل بیدرنگ — کون آیا دیکھنے کو تخت زریں کیا ہوا
ایک مرقع خواب تھا وہ طلسم دل فریب — کچھ بھی آتا ہے نظر اب خاک پتھر کے سوا
اب نظر آتا نہیں وہ تخت اور نگیں حیف — کانوں میں آتی نہیں اب کوس دولت کی صدا
اک فسانہ خواب عبرت کا ہوا ایسی سرگذشت — ہستی فانی کی یہ ہے ابتدا و انتہا

پردہ داری میکند بر طاق کسریٰ عنکبوت
چغد نوبت میزند بر گنبد افراسیاب

نوروز نور افزا

چونکہ ایران میں رسم نوروز منانے کا طریقہ مدتہا سے دراز سے جاری تھا اور شاہانِ مغلیہ ایران ہی سے ہندوستان آئے تھے اسلئے یہ رسم یہاں بھی بڑے تزک و احتشام اور پورے جشن و اہتمام سے منائی جاتی تھی۔ یوں تو نوروز کے دن قلعہ معلیٰ میں ہر جگہ ایک نئی چہل پہل اور نئی خوشی ہوتی تھی مگر نورجہاں کے نور محل میں جو طرب اندوزی و مسرت افروزی نظر آتی تھی اسکا پتہ قلعہ میں اور کسی جگہ نہ ہوتا

تھا۔ نورجہاں شیعہ بھی، اور چونکہ نوروز کے دن حضرت علیؓ ابن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ مسند خلافت پر رونق افروز ہوئے تھے اسلئے نوروز کی خوشی میں نورجہاں خاص حصہ لیتی تھی۔ اور عیدین کے دن سے زیادہ نوروز کے دن جشن ہوا کرتا تھا جسکے انتظام میں وہ ہزاروں روپیہ سیرچشمی اور کشادہ دلی کے ساتھ صرف کر دیتی تھی۔ منجم جو رنگ نوروز کے لئے مخصوص کر دیتے تھے محل کی ہر چیز پہ وہی رنگ چھایا ہوا نظر آتا تھا۔ مثلاً کسی سال کیلئے سرخ رنگ قرار پاتا تو تمام محل میں سرخ رنگ کا فرش بچھایا جاتا۔ سرخ رنگ کی چھت گیریاں لگائی جاتیں۔ سرخ ہی رنگ کے پردے ڈالے جاتے تھے اور نورجہاں بھی اس روز سرخ رنگ کا جوڑا زیب جسم کرتی۔ سرخ رنگ کے زیورات مرصع پہنتی۔ تمام کنیزیں، غلام، خواجہ سرا، چوبدار وغیرہ بھی سرخ لباس پہنتے۔ ہاتھی، گھوڑے، اونٹ، پالکی، رتھ، بہلی، تمام سواریوں کے غلاف بھی سرخ ہوتے تھے، اور یہ تمام سرخ کپڑے علی قدر مراتب نورجہاں کی سرکار سے ملتے تھے۔ سات روز تک جشن نوروز قلعہ معلی میں نورجہاں کے دم سے رہتا تھا۔ خود شاہنشاہ جہانگیر نورجہاں کی مسرتوں میں شریک ہوتے اور ایک خاص وقت دونوں مالک و ملکہ تخت نشین پر بیٹھتے۔ امراؤ روسا، اور اہل کمال اپنی اپنی جگہ رونق گزیں ہوتے، ارباب سوال پہ سوال کرتے، اور اصحاب کمال قصیدے اور تہنیت نامے لکھکر نذر دیتے سوا لاکھ روپیہ خرچ مبارک نامے کے تصدق میں نورجہاں اپنے پاس رکھتی۔ جو عین وقت جشن فقرا اور کملا میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ سات دن تک سارا آگرہ دربار نورجہاں سے مستفیض ہوتا تھا ہر شخص کی درخواست والتماس پہ نورجہاں نوروز کے دن خاص التفات اور توجہ

دیتی اور سینکڑوں نامراد بامراد ہو کر اس موقعہ سے فائدہ اٹھاتے قوال بھانڈ
منجم تال نقارچی شہنشاہی نوازش سے قدر انعام و اکرام پاتے تھے سال بھر کے
لئے فارغ المعاش ہو جاتے تھے۔ شاہی اُمراء اُس روز نورجہاں کے مہمان ہوتے
اور تمام شاہی محل کی مخدرات عصمت مآب نورجہاں کے محل میں رونق افروز
ہوتیں۔ نورجہاں سب سے مصافحہ کرتی اور اون کی خاطر داشت میں کوئی دقیقہ
اوٹھا نہ رکھتی۔ پبلک کی دلچسپیوں کا بھی خاص خیال رکھا جاتا تھا یعنی انہیں
سات دنوں میں سے ایک دن نورجہاں اور شہنشاہ جہانگیر چلمنیں ڈال کر مثمن
برج میں رونق افروز ہوتے اور نیچے لب دریا ہزاروں دوکانیں بہترین نمایش و
آرایش کے ساتھ کھولی جاتیں۔ پھر سامنے سے شہسوار۔ فیلبان اپنے اپنے کرتب
دکھاتے ہوئے نکلتے۔ قواعدداں مبارکباد اور سلامی کا باجا بجاتی ہوتی اور مجرا
کرتی ہوتی اوسطرف سے گذرتی۔ حلوائی قسم قسم کی مٹھائیوں سے دوکانوں کو
آراستہ کرتے کوئی میٹھائی کا درخت بناتا کوئی میٹھائی کا قلعہ تیار کرتا اور یہ سب کچھ
بادشاہ اور ملکہ کی آنکھوں کے سامنے لٹا دیا جاتا۔ ان سب کو حسب حیثیت انعام
ملتا تھا۔ لنگرخانہ سات دن تک جاری رہتا کہ جس کا جی چاہے آئے اور کھائے
فقرا اور مساکین کے لئے یہ حکم تھا کہ وہ پبلک کے ہنگامے میں نہ آئیں کہ اونہیں
بھی زحمت ہو اور پبلک کو بھی تکلیف اوٹھانی پڑے اونکے لئے یہ انتظام تھا کہ شاہی
پہرے دار اونہیں ناکوں پر روک لیا کرتے تھے اور وہیں انہیں کھانے پینے
کی اشیاء اور کچھ زر نقد ملجایا کرتا تھا۔ اسطرح شہر میں کوئی بدنصیب سے بدنصیب
شخص بھی نورجہاں کی دریادلی اور نوروز کی فیض رسانی سے محروم نہ رہتا۔ لوگ

سال بھر تک اُس جشن کے مزوں کو یاد کیا کرتے تھے اور اکثر ہنرمند سال بھر تک
اس دن کے لئے نئی نئی قسم کی چیزیں بنانے اور مہیا کرنے میں مصروف رہتے تھے
سات دن تک تمام کاروبار بند رہتے تھے اور دور دور سے خلقت خدا اس نورجہانی
نوروز کی دید کے لئے آتی تھی اور دامن نگاہ میں دوبارہ آنے کی تمنا بھر کر لیجاتی تھی

نوروز کا گدھا

ایکمرتبہ ایک سادہ لوح مولوی صاحب کو عجب دل لگی سوجھی اونھوں نے سوچا
کہ لڑکوں کو پڑھاتے پڑھاتے مدتیں گذر گئیں چلو آج تو نوروز کی سیر کریں کوئی ایسا
سوانگ بنا کرے چلیں کہ نورجہاں اور شہنشاہ دیکھتے ہی لوٹ ہوجائیں اتفاق سے
اس سال بحساب نجوم نوروز کی سواری میں گدھا تھا اور رنگ زرد نوروز کے لئے
مقرر تھا۔ بس مولوی صاحب نے ایک گدھا پکڑا۔ اُسے زرد رنگا اور خود بھی زرد رنگ
کے کپڑے پہنے ایک کاغذ کا مکٹ سر پر رکھا اسمیں بہت سے شیشے کے ٹکڑے لگا
لئے۔ اور پنی ہر طرف چپکالی چہرہ پہ بھی پنی لگالی اور اسے زرد رنگ لیا۔ پھر اوس گدھے
پر بیٹھ کر آپ ہنستے اور مسکراتے سلام کہتے اور تالیاں بجاتے قلعہ شاہی کے
نیچے سے نکلے۔ دو لڑکوں کے ہاتھ میں اوس گدھے کی رسی تھی مولوی صاحب
با ایں ریش وفش اوس پر رونق افروز تھا جو دیکھتا تھا ہنستے ہنستے لوٹ جاتا تھا جب یہ
گدھا مثمن برج کے نیچے سے نکلا تو مولوی صاحب کے شاگرد بچوں کی طرح چلانے
لگے کہ آج "نوروز کا مبارک جلوہ دیکھو" بار بار یہی آواز لگاتے تھے اور مولوی صاحب
ہنستے اور سلام کرتے جاتے تھے۔ یکایک نورجہاں کی نگاہ جو اوپر پڑی تو

بے اختیار ہنسی پڑی، اور حکم دیا کہ اس نوروز کے گدہے کو پانچسو روپیہ انعام دئے جائیں

ملا نوروز

اسی طرح ایک مولوی صاحب تھے جو برسوں سے اکبر آباد میں آباد تھے اور سنا کرتے تھے کہ نوروز کے دن شاعروں کو بڑے بڑے انعام ملتے ہیں ایک مرتبہ نوروز کے موقعہ پر مولوی صاحب مرزا محمد تقی بخشی کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ مرزا صاحب آپ تو ہر سال نوروز کے دن خلعتیں اور انعام واکرام لاتے ہیں اب کے تو ہمیں بھی کوئی قصیدہ غزل یا رباعی لکھدیجئے اور ایسی لکھدیجئے کہ نورجہاں سنتے ہی پھڑک جائے۔ مرزا تقی نے کچھ شعر لکھدئے جنہیں لیکر مولوی صاحب بڑے کر و فر کے ساتھ دربار میں پہنچے مرزا تقی نے مولویصاحب کے علم و فضل کا حال حاشئے پر چڑھا کر پہلے ہی کہہ رکھا تھا۔ حکم ہوا کہ پڑھیں مولویصاحب مرزا تقی کا منہ دیکھتے ہوئے ڈرتے کانپتے آگے بڑھے۔ کبھی شاہی رعب داب سے انکے حواس گم ہو جاتے تھے اور کبھی دولت حاصل کرنے کی امید ان کی ہمت بندھا دیتی تھی غرضکہ اسی امید و بیم میں انکی زبان کھلی اور انہوں نے پوری قرأت کیساتھ اعوذ باللہ اور بسم اللہ پڑھی ان کی قرأت پر نورجہاں کو ہنسی آئی مگر وہ ایک وقار کیساتھ خاموش ہو گئی اب مولویصاحب نے یہ رباعی بھی قرأت سے پڑھنی شروع کی رباعی

امروز کہ روز سعد باشد بمثل   بنشست علیٰ مسند حسن رضی عمل

از جلوۂ مہر گشت عالم پر نور   ایوان جہانگیر شدہ نور محل

نورجہان یہ رباعی سنکر خوش تو ہوئی مگر مولویصاحب سے کہنے لگی کہ رباعی بیشک

اچھی ہے لیکن "سعد کا نام حضرت علیؓ کرم اللہ وجہ کے نام سے پہلے لانا ٹھیک نہیں۔ مولوی صاحب یہ سمجھ کر کہ نورجہاں اس رباعی سے ناراض ہو گئی کہنے لگے کہ حضور میں نے ایک رافضی سے یہ شعر لکھوائے ہیں اسمیں میرا کچھ قصور نہیں ہے اس ظالم نے میرے ساتھ یہاں بھی مذہبی تعصب نکالا مجھے کیا خبر تھی کہ وہ رباعی پہ نقطہ آگے پیچھے کریگا۔ حضور میں قسمیہ عرض کرتا ہوں کہ یہ رباعی میری نہیں ہے یہ سنکر نورجہاں اور بھی ہنسی اور کہنے لگی کہ اچھا جس سے شعر لکھوائے اوسے بلواؤ مولویصاحب نے مرزا محمد تقی کیطرف اشارہ کیا۔ مرزا صاحب آئے اور وہ شعر اُن سے پھر پڑھوائے گئے۔ تو مولوی صاحب نے کہا دیکھئے حضور انکو ابھی پڑھنے کی بھی تمیز نہیں ہے سعد اور علیؓ کے عین کو حلق سے نکالنا چاہئے اور اونہوں نے زبان سے ادا کیا۔ نورجہاں سمجھ گئی کہ مولویصاحب محض اک سادہ لوح بزرگ ہیں۔ پانچسو روپیہ اور ایک قبائے رومی دیکر رخصت کیا اور مولویصاحب کا نام ملا نوروز رکھدیا۔ پھر تو ملا نوروز کی قسمت جاگ گئی۔ وہ ہر نوروز میں پہنچ جاتے اور نورجہاں ان کی ظرافت اور بھولے پن سے خوش ہو کر انہیں ہمیشہ انعام دیتی۔ مولوی صاحب سال بھر تک اپنا لباس اسی رنگ کا رکھتے تھے جس رنگ کا نوروز کے روز پہنتے تھے۔ اور ایک خاص وضع کی ٹوپی سر پر پہنتی تھی جسمیں رنگے ہوئے پر لگے رہتے تھے۔ شہر کا بچہ بچہ اونہیں جان گیا تھا اور سب میں وہ ملا نوروز کے نام سے مشہور ہو گئے تھے۔ اُن کی یہ سادہ لوحی اس تدبیر سے اونہیں ہر سال سینکڑوں روپیہ کا فائدہ کرادیتی تھی جہاں نوروز آیا اور مولوی صاحب کسی سے رباعی یا قصیدہ کہوا کر دربار میں پہنچے۔ مگر اُس دن سے پھر کبھی مرزا محمد تقی سے درخواست نہ کی۔ ان مولوی

صاحب کا نام غالباً نورالہدیٰ تھا۔ اس سے زیادہ حالات انکے دستیاب نہیں ہوتے۔

نورجہاں کی ہمدردی بیواؤں ویتیموں سے

نورجہاں اس قسم کے مراسم اور جشن اور مجالس ہی میں اپنا روپیہ صرف نہیں کرتی تھی بلکہ وہ بہت زیادہ روپیہ یتیموں اور بیواؤں کے درماں میں بھی خرچ کرتی تھی۔ ہزاروں یتیم بچے اوسکے یتیم خانے میں پرورش پاتے تھے اور ہزاروں بیوہ عورتوں کے نکاح اوس کے صرف خاص سے پڑھوائے جاتے تھے۔ وہ اس مسکین جماعت میں "شاہ مادر" کے نام سے مشہور تھی۔ بیوہ یتیموں کا انتظام گو دیگر منتظمین کے سپرد تھا تاہم ہر ہفتہ وہ بہ نفس نفیس خود بھی ان کا ملاحظہ اور معائنہ کرتی تھی اور انکی تکالیف اُن کی زبان سے سنتی تھی اور درماں ہی کی کوشش کرتی تھی اونکے آرام ت کا اُسے بہت بڑا خیال رہتا تھا۔ اور وہ یتیموں اور بیواؤں کی دعاؤں کو اپنے لئے موجب نجات اور سبب خیر و برکت سمجھتی تھی۔

نورجہاں کی حاضر جوابی

شاہی محلوں کا رہنا سہنا شہزادوں کی ہم جلیسی علم و فضل اور کمال بہتات نے نورجہاں کو حاضر جوابی میں خاص مشاق بنا دیا تھا۔ اوسے کسی بات کا جواب سوچنے میں کچھ زیادہ دیر نہیں لگتی تھی وہ فطرتاً طباع اور بذلہ سنج عورت تھی اور دیگر شاہی خواتین سے اس خصوص میں اوس کا ذہن رسا بہت زیادہ بڑھا ہوا تھا۔

تذکرۃ الفقرا میں لکھا ہے کہ علی شاہ درویش کو جب نورجہاں کے فضل و کمال کا علم

ہوا تو وہ ایک دن قلعہ کے پاس پہنچے اور چاہا کہ کسی طرح نورجہاں تک رسائی حاصل ہو مفلوک الحال تھے اور انقلاب نے ان کی حالت کو ردی کر رکھا تھا۔ گدڑی کاندھے پر ڈالے ہوئے جا ہی پہنچے۔ مگر اب وہاں تک جائیں تو کیوں کر۔ کئی دن اس حسرت میں گذر گئے روز جاتے اور قلعہ کا چکر لگا کر چلے آتے۔ ایک دن نورجہان اپنے باپ مرزا غیاث کے پاس آئی ہوئی تھی اور شام کے وقت پائیں باغ میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ گلگشت میں مصروف تھی۔ نور علی شاہ کو خبر ملی کہ وہ آج قلعہ میں نہیں ہے بلکہ اپنے باپ کے گھر ہے فوراً ہی تو پہنچے اور باغ کی دیوار کے پیچھے کھڑے ہو کر زور سے ایک آواز لگائی

گر از دل من روشنی نور بر آید
ہر ذرہ تجلی دہ صد طور بر آید

نورجہاں اس قسم کی صداؤں سے خاص دلچسپی رکھتی تھی جن میں اس کے نام کا کوئی لفظ استعارتاً یا اشارتاً آجاتے۔ اوس نے اس صدا کو سنا تو ایک کنیز سے کہا دیکھو باغ کی دیوار کے پیچھے کوئی شخص ہے اسے اندر لے آؤ۔ کنیز گئی تو دیکھا ایک گدڑی پوش فقیر کھڑا ہوا دیوار سے باتیں کر رہا ہے۔ کہنے لگی چلئے سرکار بلاتی ہیں۔ فقیر تو یہ چاہتا ہی تھا فوراً ساتھ ہو لیا۔ باغ میں پہنچا تو نورجہاں پردہ کی آڑ میں کھڑی ہو گئی اور پوچھنے لگی کہ تمہارا کیا سوال ہے۔

فقیر۔ میں تو ایک غریب فقیر ہوں اور خدا کے گھر (بیت اللہ) جانا چاہتا ہوں۔

نورجہاں۔ مگر خدا غریب کو اپنے گھر کی طرف آنے کی اجازت نہیں دیتا۔

فقیر۔ تو مائی اپنے آستانہ پر پڑا رہنے دے۔

نورجہاں۔ میں تو خود شہنشاہ کے گھر میں رہتی ہوں۔

فقیر۔ تو مجھے بھی بادشاہ کے گھر میں جگہ دلوا دے۔

نورجہاں۔ بھلا وہاں فقیر کے رہنے کا کیا کام ہے۔

اتنے میں ایک خواص بول اوٹھی کہ یہ فقیر گستاخ ہے ہماری سرکار سے باتیں بنائے چلا جاتا ہے فقیر بولا کہ تمہاری سرکار مجھ سے زیادہ چالاک ہیں کہ نہ تو فقیر کو اپنے پاس رکھتی ہیں نہ بادشاہ کے گھر میں جگہ دیتی ہیں نہ خدا کے گھر جانے دیتی ہیں یہ سنکر نورجہاں بے اختیار ہنس پڑی اور فقیر کو ایک ہزار روپیہ نقد اور ایک سنہری کڑوں کی جوڑی اسی وقت عطا فرمائی اس سے نورجہاں کی مسکین نوازی کے ساتھ اوسکی حاضر جوابی کا بھی پورا ثبوت ملتا ہے۔

ایک مرتبہ رمضاں کا مہینہ ختم ہوا اور عید کا چاند نکلا تو شہنشاہ جہانگیر نے چاند دیکھ کر نورجہاں سے مسکرا کر فرمایا۔

ہلال عید بر اوج فلک ہویدا شد

نورجہاں نے فوراً یہ مصرع برجستہ کر کے جواب میں سنایا۔

کلید میکدہ گم گشتہ بود پیدا شد

ایک مرتبہ بادشاہ اپنے شاہی باغ میں مصروف سیر تھے نورجہاں بھی ساتھ ہی ایک جگہ چار مخدرات محل شاہی کھڑی ہوئی تھیں جہانگیر نے اُن عورتوں کو دیکھ کر نورجہاں سے مخاطب ہو کر کہا۔

ہر چار عناصر گرامی ہستند

نورجہاں نے دوسرا مصرع فوراً اس طرح نظم کر کے سنایا۔

شہ جاں بہمہ نشہ سرمستند

ایک مرتبہ شہنشاہ جہانگیر نے سفید حریر کی قبا زیب بدن کی اور اسمیں لعل
رمانی کا بٹن لگایا اور نورجہاں کے پاس آیا نورجہاں نے دیکھتے ہی یہ شعر موزوں کیا

ترا نہ تکمۂ لعل است در قبائے حریر — شدہ است قطرۂ خون منت گریبان گیر

یہ حکایت بھی مشہور ہے جو نورجہاں کی ذہانت و دانائی پر دال ہے کہ ایک
مرتبہ وہ ایام سے تھی کہ شہنشاہ جہانگیر نے اظہار شوق کیا۔ نورجہاں نے اسکے
جواب میں اسطرح عذر کیا۔

بخون من اگر شاہا دلت خوشنود می گردد
بجان منت ، اوستیغ تو خون آلود می گردد

جہانگیر اس عذر در پردہ کو سمجھ کر خاموش ہوگیا۔ ایک مرتبہ پھر ایسا ہی اتفاق ہوا
تو نورجہاں نے عرض کیا۔

ظاہرم منگر گرچہ سر بسر سبزم — ولیک باطن من چوں حنا پر از خون است

تیسری مرتبہ پھر ایسا ہی موقع پیش آیا۔ نورجہاں نے اس مطلع کے بعد یوں
عذر خواہی کی۔

دست از گل چیدنم امشب بدار — میچکد از برگ گلم آب انار

ان تمام واقعات سے نورجہاں کی بذلہ سنجی اور حاضر جوابی کا پورا پورا ثبوت ملتا ہے

نورجہاں شاعر بھی تھی

حسن اتفاق سے نورجہاں کے عہد طفلی میں چند اتالیق ایسے مقرر ہوئے تھے
جو اس زمانہ کے زبردست شاعر تھے اور گو نورجہاں نے باقاعدہ اس فن کو کبھی

اوستاد سے حاصل نہیں کیا تھا تاہم وہ دیوان اور فارسی کلیات وغیرہ دیکھ
دیکھ کر خود بھی کبھی کبھی کچھ لیا کرتی تھی۔ اوسنے اپنا کلام کسی کو بغرض اصلاح
نہیں دکھایا۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ محلات شاہی میں شاعری معیوب سمجھی جاتی
تھی بلکہ وہ اپنے خداداد ذہن پر نازاں تھی اور اپنی طبیعت سے خود مدد لیکر
اس فن مبارک میں ترقی کرنا چاہتی تھی۔ جب اوسکے خود ساختہ اشعار سنکر شہنشاہ
جہانگیر خوش ہوتے تو اوسکا حوصلہ اور بھی بڑھ جاتا تھا اور طبیعت اوسے اس فن
مبارک میں ترقی کرنا چاہتی تھی جب اوسکے خودساختہ اشعار سنکر شہنشاہ
جہانگیر کی زبان میں سنتے۔ کہتے ہیں کہ شیر افگن خاں اپنے شوہر کے قتل ہو جانے
پر اوس نے ایک بسیط مرثیہ بھی لکھا تھا۔ مگر افسوس کہ اوسکا کوئی شعر کسی شعر
میں نظر سے نہیں گذرا۔ اوسکی شاعرانہ ترقی کا سبب اوسکی ہمعصر خواتین بھی تھیں
جنمیں سے بعض نہایت خوشگو شاعرہ تھیں اور اوسکی صحبت و ہم جلیسی میں رہکر
اوسکے لئے ناممکن تھا کہ وہ اس شوق سے محفوظ رہے۔

نورجہاں کا کوئی دیوان مکمل مطبوعہ یا غیر مطبوعہ بھی کہیں نظر نہیں آیا۔ اوسکے
بعض اشعار جو اوسکے نام سے منسوب ہیں ہم مورخ نے نقل کئے ہیں اور انہیں
سے اوسکی شاعرانہ قابلیت پر کسی قدر روشنی پڑتی ہے بعض اشعار جو ہمیں
اکثر تواریخ معتبرہ میں ملے یہاں بھی نقل کئے جاتے ہیں۔

دل بصورت نہ دہم تا شدہ سیرت معلوم — بندۂ عشقم و ہفتاد و دو ملت معلوم
زاہدا ہول قیامت مفگن در دل من — ہول ہجران گذرانیدم و قیامت معلوم

چناں زاہد کہ جام بادۂ گلگوں بگیر دائم　　　　مرو در کعبہ کانجا نیست جز خون جگر خوردن

نورجہاں کی معاصر عورتوں میں سے ایک جانان بیگم بھی تھیں جو عبدالرحیم خانخاناں
کی لڑکی تھیں علاوہ شاعر ہونے کے انہیں زہد و پارسائی کا مادہ حد سے زیادہ بڑھا
ہوا تھا عفت عصمت پناہ خواتین کی فہرست میں زمانہ نے ان کا سب سے اول نمبر
لکھا ہے چنانچہ ایک مسلم روایت ہے کہ جب ان کے حسن اور علم کی شہرت پہنچی تو
شہنشاہ جہانگیر نے انہیں شادی کا پیغام دیا۔ بادشاہ کا پیام اور پھر ایک معمولی
ملازم شاہی کی لڑکی کے نام اس کا مان لینا خود خانخاناں کے نام باعث فخر تھا
مگر جانان بیگم نے شاہی محلوں کی بیگم بننا پسند نہیں کیا۔ اور اپنے دانت توڑ کر اور بال
کاٹ کر بادشاہ کے حضور میں بھیج دیئے یہ حال دیکھکر جہانگیر کو سخت افسوس ہوا۔
اور جانان بیگم کا کچھ وظیفہ مقرر کر دیا یہ ایک شعر ان کی طرف منسوب ہے۔

عاشق ز خلق عشق تو پنہاں چساں کند　　　　پیداست از دو چشم تر من خون گریستن

سلیمہ بیگم بھی جو بیرم خاں کی زوجہ تھیں شاعری سے خاص مذاق رکھتی تھیں ان کا
بھی ایک شعر دیکھا گیا ہے

کاکلت را ز مستی رشتۂ جاں گفتہ ام
مست بودم زیں سبب حرف پریشاں گفتہ ام

حبیب اللہ ترک کی بیوی شفیعہ خانم بھی نورجہاں کی ہم جلیسوں میں تھیں اور شاعری
سے خاص تعلق رکھتی تھیں۔ ان کی ایک رباعی مشہور ہے

روزے کہ بجویان وصل جہاں گشتم　　　　شرمندہ ز انتظار مہ لیاں گشتم
زاں چشمۂ حیواں گشتہ ہم آب لبے　　　　از زندگی خویش پشیماں گشتم

ان واقعات کی تشریح سے مقصد یہ ہے کہ نورجہاں کے زمانے میں خود اس کے
صنف میں بعض نہایت خوش گو شاعرہ عورتیں موجود تھیں مگر نورجہاں کی شخصیت بھی
اور ذہانت و ذہن رسا نے کسی کی قابلیت کا چراغ اس کے سامنے روشن نہ ہونے
دیا۔ اور یہی وجہ تھی کہ جہانگیر باوجود مشکلات کے بھی نورجہاں کے خیال سے باز نہ آیا۔
اور اسے اپنی ملکہ بنا کر رہا۔ نورجہاں شیر افگن کی بیوی بن چکی تھی وہ نا کتخدا تھی کہ
جہانگیر اس کے لئے دیوانہ ہو رہا تھا۔ مگر اس کے حاصل کرنے کے لئے جو وقت جہانگیر
کو بہت زیادہ مضطرب اور وحشی بنا سکتی تھی وہ نورجہاں کی اعلیٰ قابلیت اور
روشن ذہنی تھی۔ اور اسی ایک وصف نے اسے اس کی تمام معاصر خواتین میں ممتاز کر دیا تھا۔

نورجہاں کی مصیبتوں میں آغاز انقلاب

کبھی شادی کبھی ماتم کبھی عشرت کبھی حسرت
ہمیشہ ایک سی حالت نہیں رہتی زمانے کی

یہ زمانے کی خاصیت ہے کہ ہمیشہ ایک حالت پر نہیں رہتا۔ اس کے واقعات و حالات میں ہمیشہ
تغیر ہوتا رہتا ہے اور انقلاب دائمی اپنے جلوے دکھاتا رہتا ہے۔ کوئی بادشاہ ہو
یا فقیر، امیر ہو یا غریب کبھی ایک حالت میں نہیں رہ سکتا۔ نورجہاں بھی اس قاعدے سے مستثنیٰ
نہیں رہی اور اسے بھی مصائب دنیوی کا شکار ہونا پڑا۔ سب سے پہلے جس مصیبت
نے اسے خستہ کیا وہ اس کی ماں عصمت بانو بیگم کا انتقال تھا۔ عصمت بانو کی بہ تدبیری اور
نگرانی نے نورجہاں کو ایک باسلیقہ شہزادی کی طرح پالا تھا۔ اور اس کی اعانت خصوصاً
سے نورجہاں کی شہرت میں ترقی ہوئی تھی۔ عصمت بانو بیگم کو جہانگیر اپنی حقیقی ماں سے

زیادہ سمجھتا تھا اور اسکی تکریم و تعظیم اور خبرگیری میں مصروف رہتا اسکے مرنے کا
افسوس گو سب سے زیادہ نورجہاں کو تھا یعنی جہانگیر اور نورجہاں کا باپ مرزا غیاث اور
اس کا بھائی آصف خان بھی اس رنج سے ہمکدوش تھا سب مرضی الٰہی کے شکر میں
مائل رہتے تھے اور اسکی یاد اور نیک خوبیوں کے افسوس ہائی تھی آخر کار شہنشاہ جہانگیر
کی مہربانیوں اور دلجوئیوں نے اس ساتھ جہان گذار کو چند دنوں سے بالکل مجبور کردیا
ابھی اس واقعہ کو کچھ زیادہ زمانہ نہیں گذرا تھا کہ مرزا غیاث نورجہاں کے والد بھی اس
دنیا سے بیمار ہو کر ۱۰۳۲ھ میں انتقال کیا۔ مرزا غیاث اپنی استعداد و تدبر کی وجہ
سے اور نورجہاں کے وسیلہ سے جہانگیر کے دربار میں منصب وزارت تک پہنچ گیا تھا۔ اکبر
کے زمانہ میں صرف دیوان بیوتات تھا مگر جہانگیر نے اسے اپنا وزیر بنا لیا تھا اور اعتماد الدولہ
کے معزز لقب سے ممتاز کیا تھا۔ "اعتماد الدولہ" کے مرنے سے نورجہاں کی پولیٹیکل قوت
میں بہت زیادہ ضعف پیدا ہو گیا اور وہ ان مصائب ہجر اور بیکسی و بیسری کی
مصیبتوں میں گرفتار ہو کر بہت زیادہ ضعیف ہو گئی۔ اسکا دل ہر وقت دکھا ہوا
رہتا تھا۔ اور چہرہ اداس ہو جاتا تھا وہ خوش تھی کہ اسکی ماں خلعت شاہی میں
ایک خاص عزت اور مرتبہ رکھتی تھی اور وہ شاد تھی کہ اسکا باپ شہنشاہ ہندوستان
کا وزیر اعظم ہے۔ مگر اب قسمت نے ان دونوں رفیقوں اور سرپرستوں کو اس سے چھین
لیا۔ اور وہ بیکس و بے بس رہ گئی۔ جہانگیر نے بہ نظر دلجوئی وہی عہدہ نورجہاں کے باپ
مرزا غیاث کو دیا تھا۔ اب اس کے بھائی آصف خان کو دیدیا اور آصف جاہ کے لقب
سے معزز فرمایا۔ یہ سب کچھ تھا مگر نورجہاں کے دل میں جو داغ مرگ پدر اور انتقال
مادر سے پڑ گئے تھے۔ انکا مندمل ہونا غیر ممکن تھا۔ ان حوادث سے اسکی طبیعت ۔

اعتماد الدولہ آگرہ

خاص فرمان مہابت خاں کے نام جاری کیا کہ "جب تک آصف جاہ کو حساب
نہ سمجھا دو، اور اپنے مظالم کا جواب نہ دے لو جاگیر موقوف اور دربار میں حاضری
مسدود ہے" اسوقت بادشاہ معہ اپنے لشکر اور آصف جاہ نورجہاں کے دریائے
جہلم کے اس پار مقیم تھا مہابت خاں کو جب یہ جواب لکھا گیا تو آصف جاہ معہ
لشکر و فوج دریا پار چلا گیا۔ اور بادشاہ کو معہ حرم سرا اور چند خواجہ سراؤں کے
اس پار تنہا چھوڑ گیا بیشک یہ آصف جاہ کی ایک بہت بڑی غلطی تھی لیکن وہ
غرور تکبر خسروانہ اور الطاف شاہانہ پر پھولا ہوا تھا۔ اس لئے انجام کار پر اوسنے
نظر بھی نہ ڈالی۔ نہ وہ یہ سمجھا کہ مہابت خاں کس گھات میں ہے اور کس پر وہ
ہی اپنا انتقام لینا چاہتا ہے ادھر تو آصف جاہ دریا پار ہوا ادھر مہابت خاں
پانچ ہزار راجپوتوں کے ساتھ شاہی کیمپ پر آ پڑا۔ کیمپ ہر طرف سے گھیر لیا گیا
اور راجپوتوں کا لشکر ہر طرف نظر آنے لگا۔ یہ غل پہ شور اور یہ ہنگامہ دیکھکر جہانگیر
اپنے کیمپ سے باہر آیا مہابت خاں دوڑ کر حاضر ہوا۔ پوچھا مہابت خان
کیا ہنگامہ ہے۔ عرض کیا کچھ نہیں حضور کی پناہ میں آیا ہوں میرا قصور معاف
کیا جاوے یہ کہہ کر بادشاہ پر تصدق ہوا اور پالکی منگوائی بادشاہ کو اسمیں بٹھایا
اور خود کشاں کشاں اپنے خیمہ میں لے گیا وہاں پہونچکر پہرہ حکم دیا کہ بادشاہ
نظر بند رہیں اور کسی طرح یہاں سے نکلنے نہ پائیں۔ مگر پھر اسے خیال آیا کہ
افسوس نورجہاں باہر رہ گئی جس کا دفاع کرنے کیلئے یہ تمام چالاکیاں اور
حیلہ سازیاں کی گئیں وہ تو ہاتھ نہ آئی پھر بادشاہ کو سوار کرکے شاہی کیمپ میں
لایا مگر یہاں آ کر دیکھا تو نورجہاں کو نہ پایا اور معلوم کہ وہ اپنے بھائی کے پاس

دریا پار چلی گئی۔ نورجہاں جب اپنے بھائی کے پاس پہنچی تو اس نے آصف جاہ
اور سرداران لشکر کو بری طرح لتاڑا اور اس طرح تنہا چھوڑ آنے پر لعنت ملامت
بھیجی۔ ادھر بادشاہ نے حکم بھیجا کہ نورجہاں کو فوراً یہاں بھیجو مگر وہ نہ آئی اور
مہابت خاں کو اسکی چالاکیوں کا مزا چکھانے کی تدبیریں سوچنے لگی۔ پھر اسکا چارہ
ہی کیا تھا۔ کہ مہابت خاں کے لشکر پر حملہ کر دیا جائے۔ گو بادشاہ کے احکام
میں حملہ کرنے کی سخت ممانعت تھی تاہم وہ نہ مانی اور ایک سردار کو معہ فوج
کے دریا پار اتار دیا لیکن سردار معہ فوج کے ناکام واپس آگیا۔ دوسرے دن
نورجہاں خود مقدمۃ الجیش بنی اور ایک ہودج میں ہاتھی پر بیٹھی شہریار کی
چھوٹی سی بچی کو گود میں لیا اور ہاتھی کو دریا میں ڈال دیا۔ پیچھے پیچھے فوج تھی اور
آگے آگے ملکہ۔ آخر کار میدان کارزار گرم ہوا۔ ہزاروں آدمی ادھر ادھر کے
ضائع ہوئے۔ لڑکی نورجہاں کی گود میں کسی ظالم کے تیر سے زخمی ہوئی یہاں تک
کہ نورجہاں کو واپس لوٹنا پڑا۔ ان واقعات نے مہابت خاں کو حضور بادشاہ بیگم
فتنہ پردازی اور کینہ وری کا موقعہ دیا وہ کہنے لگا۔ دیکھئے حضور حالانکہ بیگم صاحبہ
آپکی موجودگی سے واقف نہیں اور جانتی نہیں کہ آپ یہاں بنفس نفیس موجود ہیں
پھر بھی آپکی کچھ پرواہ نہ کی اور آپکے احکام پر توجہ نہ کی اور آپ کے خلاف علم بغاوت
بلند کرکے ہزاروں آدمیوں کا نقصان کر ڈالا۔ آصف جاہ اپنی بہن کی شہ پر
تو ضرور کوئی ایسا کام لینا چاہتے ہیں جو نتائج کے لحاظ سے خطرہ میں ڈالنے والا ہے
ان کی قوت کو توڑنا حضور جہانگیر خاں کا سب سے بڑا فرض ہے۔ بادشاہ چونکہ
اس وقت ایک عجیب کشمکش کے عالم میں گرفتار تھا اسکی سمجھ میں کوئی بات نہ آئی

اور مہابت خاں کے کہنے سے نور جہاں کو قسمیں دے کر بلوا بھیجا۔
نور جہاں گو غصہ اور انتقام کی آگ سے برافروختہ ہو رہی تھی تاہم بادشاہ کی
بیوی تھی۔ اور اسکے احکام سے سرتابی ناممکن تھی لہذا کچھ خیال کر کے وہ تنہا
چلی آئی۔ اور ایک الگ خیمہ میں فروکش ہوئی۔

مہابت خاں نے جہانگیر سے کہا کہ اب اچھا موقع ہے حضور نورجہاں کے
قتل کا حکم دیدیں تاکہ موجودہ سازشوں کا سدباب ہو جائے اور بندگان عالی
کو کبھی [illegible] میں تعجب ہو۔ بادشاہ نے جبراً قہراً اقتضائے وقت سے مجبور
ہو کر نورجہاں کے قتل کا محضرنامہ لکھدیا اور مہابت خاں کے حوالے کیا
مہابت خاں نے ایک خواجہ سرا کو بلایا اور وہ محضرنامہ دیکر کہا کہ نورجہاں کے
خیمہ میں جاؤ اور یہ حکمنامہ دکھا کر واپس آؤ جب خواجہ سرا نورجہاں کے خیمہ
میں پہنچا اور وہ شاہی محضرنامہ دکھایا تو نورجہاں کا خون خشک ہو گیا اسکے
ہاتھ کے طوطے اڑ گئے اور قتل و ہلاکت کی تصویریں اوسکی نگاہوں کے سامنے
پھرنے لگیں مگر اسنے استقامت اور حوصلہ کو آخر وقت تک ہاتھ سے نہ دیا
[illegible] سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے
مگر اتنا ضروری چاہتی ہوں کہ ایک مرتبہ حضور کے دیدار فیض آثار سے مشرف
ہولوں اوس کے بعد مجھے قتل کر دیا جائے۔

جب یہ تحریر حضور بادشاہ میں پہنچی تو مہابت خاں نے اسکے نہ ملنے پر اصرار
کیا بادشاہ پر اپنی تنہائی اور بے بسی کی وجہ سے کچھ ایسا رعب چھایا ہوا تھا
وہ اپنی تمام تدابیر اور شاہانہ تدبر کو بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اپنے تخت سلطنت

سے دور تھا۔ لشکر اوس کے پاس موجود نہ تھا اور پھر اوسکے قبضہ میں سخت
جس کو وہ تنفر کی نگاہوں سے دیکھ چکا تھا۔ کیا کرتا۔ مجبور تھا۔ مگر نورجہاں کی
مایوسانہ تحریر میں کچھ ایسی محبت جھلک رہی تھی کہ اوسنے مہابت خاں کی منت
وسماجت کر کے اوسے ملاقات پر راضی کر لیا۔ اور یہ شرط قرار پائی کہ
جس وقت نورجہاں بادشاہ سے ملے مہابت خاں بھی وہاں موجود
ہو۔

مختصر یہ ہے کہ نورجہاں اپنے خیمہ سے سکھ پال میں بیٹھ کر بادشاہ کے
کمرہ میں آئی۔ اس کے کپڑے میلے ہو رہے تھے۔ بال پریشان تھے۔ چہرہ
اداس تھا۔ ہاتھوں میں سونے کی ہتکڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اسی عالم
مایوسی میں نورجہاں اپنے سرتاج کے سامنے آکر خاموش کھڑی ہو گئی اور
ایک [illegible] نداز محبوب سے خدا جانے اوسنے کیا کہہ دیا کہ
بادشاہ [illegible] میں آنسو بھر آئے اور وہ ہونٹھ چبا کر اور سر جھکا کر دو
منٹ کے لئے خاموش ہو گیا۔

پولیٹیکل دشواریاں کیسی سخت ہوں۔ مگر یہ ناممکن بات ہے کہ جو ہاتھ محبت
کے ساتھ کسی گردن میں حمائل ہوں اور جو دل کسی زلف پریشان میں گرفتار
ہو چکا ہو اوسی گردن اور زلف والے کے ساتھ وہی ہاتھ اور دل
ایسا کام کریں جو دنیا سے محبت میں آج تک کسی نے نہیں کیا۔

نورجہاں کی بیکسانہ حالت اور اسکی گذشتہ عزت و عظمت اور اپنی
محبت کا خیال کر کے جہانگیر رو دیا۔ اور مہابت خاں سے کہنے لگا کہ "میں نورجہاں

کے قتل کا حکم واپس لیتا ہوں۔ مہابت خاں نے بہت کچھ سمجھایا اور خیالات
بدلنے کی کوشش کی مگر بادشاہ کے چھلکتے ہوئے آنسوؤں اور ابلتی ہوئی
آنکھوں کو دیکھ دیکھ کر وہ ڈر گیا۔ اور سوائے اس کے اور کچھ نہ کہہ سکا۔
کہ حضور مختار ہیں جو چاہیں کریں۔

مہابت خاں گو اپنے جوشِ انتقام میں اندھا ہو رہا تھا تاہم وہ یہ ضرور سمجھتا تھا
کہ اگر شہزادگان سلطنت کو جہانگیر کے اس حال کا علم ہو گیا تو وہ فوراً فوج
کشی کر کے فوراً یہاں پہنچ جائیں گے۔ اور ذرا سی دیر میں کشتوں کے پشتے لگ
دیں گے چنانچہ یہی ہوا کہ گو نورجہاں کی جان بخشی ہو چکی تھی۔ مہابت خاں کے
قصور معاف کر دیئے گئے تھے۔ اور بادشاہ معہ تمام لشکر اور آصف جاہ و
نورجہاں ایسا ہی اچھوتوں کے نرغے میں مہابت خانی انتظامات کے تحت میں
شاہی لشکر کابل کے قریب جا پہنچا تھا پھر بھی شاہزادہ خرم شاہجہاں
کمک لیکر اور دارا شکوہ اور رنگ زیب معہ جرار فوجوں کے کابل جا پہنچے۔
ادھر نورجہاں نے اپنا لاکھوں روپیہ کا زیور فروخت کر کے افغانی فوج جمع کر لی
اور حکمران شہزادوں کو اپنا ہمراہ خواہ بنا لیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جہانگیر مہابت خاں
کی نظر بندی سے محفوظ ہو گیا۔ اور مہابت خاں کا جوشِ انتقام درماندگی
و ناکامی سے بدل کر ہمیشہ کے لئے خاموش اور ٹھنڈا ہو گیا۔

آصف جاہی

اب جہانگیر کی تمام قوتیں ضعیف ہو چکی تھیں اور سلطنت کا تمام کاروبار آصف جاہ
برادر نور جہاں کے ہاتھ میں تھا جہانگیر کا یہ قول تھا "من سلطنت را بہ نور جہاں بیگم
ارزانی داشتم و بجز یک سیر شراب و نیم سیر گوشت ہیچ نمی باید" نور جہاں کی
لاڈلی جو شیر افگن کے صلب سے تھی اوسکی شادی جہانگیر کے شہزادے
شہریار سے ہو گئی تھی۔ اور آصف جاہ کی لڑکی ارجمند بانو بیگم (ممتاز محل)
شہزادہ خرم (شاہجہاں) سے منسوب ہو چکی تھی جہانگیر کے دور سلطنت کا
ستارہ قریب الغروب تھا اور جانشینان سلطانی میں خسرو کی پوشیدہ سازشیں
در پردہ وہ بے پردہ ہو رہی تھیں۔ نور جہاں چاہتی تھی کہ اپنے داماد کو تخت
نشین کرے اور آصف جاہ چاہتا تھا کہ اپنے داماد کو تخت پر بٹھائے۔ اس
جدوجہد نے دونوں بہن بھائیوں میں نفاق ڈالدیا۔ افسوس مال و دولت
اور سلطنت کی خواہش بھی کیسی بُری چیز ہے آصف جاہ نے نور جہاں کی
اس برکت اور خوش نصیبی کو بھی دل سے بھلا دیا جسکی وجہ سے وہ آج
دستور معظم اور آصف جاہ کہلانے کا مستحق ہوا۔ وہ بھی بہن کے ان تمام
حقوق و مراحم کو بھول گیا جو اس کی وجہ سے آصف جاہ کو ملے تھے۔
اور در پردہ اوسکی امیدوں پر خاک ڈالنے کی کوشش کرنے لگا۔ نور جہاں
نے بھائی کو بہت کچھ سمجھایا۔ مگر دولت پرستی نے اوس کی آنکھوں پر
سنگدلی کا پردہ ڈالدیا تھا اور سلطنت کی دلکش تصویر پیش نظر

نصیبی کا رنگ جھلکتا نظر آتا تھا ادہر تقدیر اوسکے ساتھ تھی اور وعدے
کررہی تھی کہ ہاں ہم شاہجہاں کو تخت سلطنت کا وارث کرینگے۔ اے کاش!
آصف جاہ اقسمت پہ شاکر رہتا وہ اپنی بہن کو اپنی طرف سے بدظن نہ کرتا
ہوتا وہی جو آگے چل کر ہوا۔ مگر نورجہاں اپنے ساتھ آصف جاہ کیطرف
سے بدگمانیاں لے گئی اون کی تلافی نہیں ہوسکتی۔

روضۂ ممتاز محل یا تاج گنج

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمین است وہمین است وہمین است

اس سے تو کون انکار کرسکتا ہے کہ نورجہاں کے بھائی آصف جاہ کو جو مناسب
جلیلہ اور مراتب عظیمہ سلطنت مغلیہ میں حاصل ہوئے وہ صرف نورجہاں کی وجہ
سے ہوئے۔ مگر پولیٹکل حقوق طلبی میں بالآخر نورجہاں پر اوس کے بھائی کو
جو فتح حاصل ہوئی۔ وہ اُن تمام شکستوں سے زیادہ موثر تھی جو نورجہاں کو اوسکی
عمر گذشتہ میں نصیب ہوئیں۔ نورجہاں کی بھتیجی ممتاز محل شاہجہاں سے
منسوب ہونے کے بعد اور شاہجہاں کو تخت شاہی حاصل ہونے کے بعد ہر
عروج آصف جاہی مناصب کو حاصل ہوا اور نورجہاں اسی غم میں تاخر گھل گھلکر
مر گئی۔

یہ وہی ممتاز محل ہے جس نے مرنے کے بعد اپنے روضہ کی وجہ سے دنیا
میں حیات جاوداں پائی اور نورجہاں سے زیادہ شہرت اسکے حصہ میں آئی۔

روضہ تاج محل آگرہ
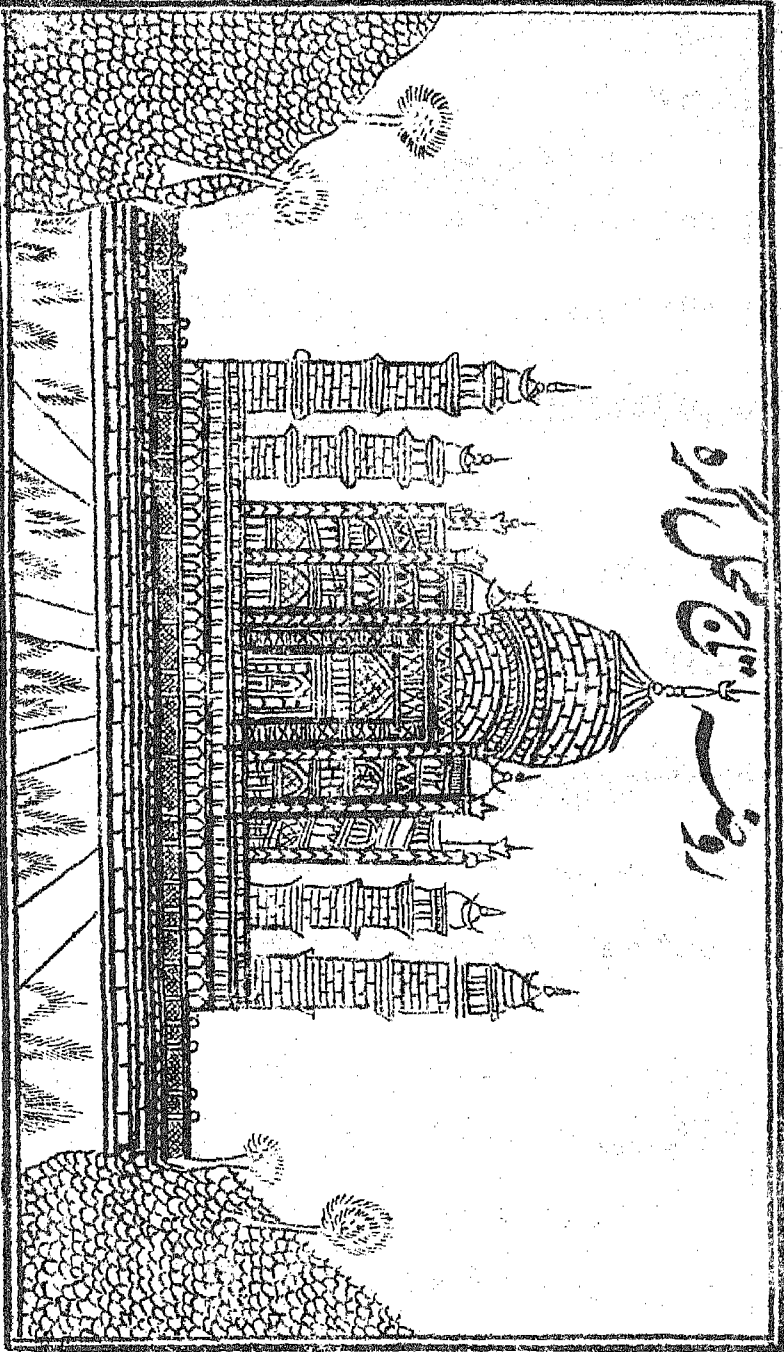
ممتاز محل کے مرنیکے بعد شاہجہان نے کوشش کی کہ بڑے بڑے کاملان فن کو تعمیر روضہ کے لئے قسطنطنیہ اور بلاد عرب و عجم سے ہندوستان بلوایا اور سالہا سال کی مصروفیت کے بعد کروڑوں روپیہ صرف کرکے ممتاز محل کا روضہ بنوایا۔ جبتک روضہ کی تعمیر جاری رہی ممتاز محل کی لاش وہیں بیرونی حصہ صحن میں امانتاً سپرد خاک رہی اور بعد تکمیل تہ خانہ میں دفن کی گئی اوسکی قبر کے پہلو میں شاہجہان نے اپنی قبر کے لئے بھی جگہہ چھوڑوا دی تھی اوحسب وصیت مرنے کے بعد وہیں دفن کیا گیا۔

روضۂ تاج گنج کی نزہت و بہار تو اوسوقت دیکھنے کے قابل ہوگی۔ جبکہ عہد شاہجہانی میں تزک و احتشام کے ساتھہ اسکی رونقیں بڑھانیکا انتظام کیا جاتا تھا۔ مگر اب بھی تمام بہاریں لٹنے کے بعد جو پاکیزگی اور خوش اسلوبی روضہ کو حاصل ہے کسی دوسرے مدفن کو ہندوستان میں کبھی نصیب نہ ہوئی

گو اب روضہ میں میوہ دار درختوں کا پتہ نہیں تاہم گورنمنٹ برطانیہ کی کشادہ دلی نے اب بھی اوسکے مضافات اور متعلقات کو شاداب و سیراب بنا رکھا ہے سرسبز باغات اور چمن نے روضہ کی سفید دیوار برق عمارت کو چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے۔ ایک طرف دریائے جمنا اوسکی دیوار کے نیچے حسرت و افسوس میں سر ٹپک رہی ہے۔ اوسکے بلند مینار اپنی شوکت رفتہ کا پتہ دے رہے ہیں فوارے جو اب صرف اتوار کو چھوٹتے ہیں پھوٹ پھوٹ کر رونق ہائے گذشتہ کے لئے روتے ہیں۔ شاہی زمانہ کا ایک آدہ درخت اب بھی موجود رہے جو کسی کی زلف خمدار کیطرح بیسیوں خم کہا گیا ہے۔ اور اس کا ہر زخم

زبان حال سے کہہ رہا ہے کہ میں نے شہزادیان سلطنت مغلیہ کے گیسوئے دراز انہیں مضافات تاج میں بستہ اور کشادہ ، بیلچے ہوئے اور بکھرے ہوئے مدتوں دیکھے ہیں۔ روضہ تاج گنج دنیا کی سات عجائب و غرائب چیزوں میں سے ایک مان لیا گیا ہے۔ یورپ کے سیاح جو ہندوستان آتے ہیں اس سر بفلک عمارت کو دیکھ کر انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔

چاندنی رات میں یہ سنگ مرمر کا نورانی روضہ چشم نظارہ میں جنت الفردوس کا ٹھنڈا اور سہانا سماں پیدا کر دیتا ہے۔ محرابوں پر بخط نسخ آیات قرانی کندہ ہیں جنہیں یہ صنعت تحریر رکھی گئی ہے کہ حروف کی جسامت دور و نزدیک سے یکساں نظر آتی ہے۔ روضہ کی عالی شان عمارت دیکھ کر عقل چکرا تی ہے کہ جن لوگوں نے اس روضہ کو تعمیر کیا ہے وہ اپنے فن میں کیسا ید طولی رکھتے تھے منبت کاری کا کام دیکھکر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر حصہ تاج اور ہر پتھر ڈھال ڈھال کر اپنی جگہ پر رکھا گیا استحکام ایسا کہ سینکڑوں برس سے شکست و ریخت سے عمارت روضہ بری ہے اور ایسی ہی پر ہی بنی کھڑی ہے۔ جا بجا حوض ، حوضوں میں رنگ برنگ کی مچھلیاں ، مسجد ، بارہ نشین ، وغیرہ ایسے دلکش نظارے ہیں کہ زباں سے بے اختیار داد نکلجاتی ہے۔ یوں تو ہر سیاح نے روضہ تاج گنج کی سیر سے لطف نظارہ اٹھا کر اپنے مقدور اور لیاقت کے موافق اسکی تعریف میں رطب اللسانی کی کسی نے اسے "رونق روئے زمین" قرار دیا کسی نے "جنت ہندوستان" لکھا مگر جیسی انتہائی تعریف

لیڈی کرزن نے سیر کیو تمت تاجگنج کی کی وہ اپنے جذبات کی جامعیت اور اپنے صداقت آفرین الفاظ کی سلامت کی وجہ سے مستغنی از تعریف ہو گئے ہیں کہ لیڈی کرزن نے جب پہلے پہل روضہ کو دیکھا تو اوسکی زبان سے بے اختیار یہ الفاظ نکل گئے کہ "اگر مجھے یقین ہو کہ میرا شوہر میری قبر پر بھی ایسا ہی روضہ بنوا دیگا۔ تو میں اسی وقت جان دینے کو تیار ہوں"

خموش اے لطیف الخیال خاتون خموش۔ دیکھ ممتاز محل، اپنی تمام شوکتوں اور دل آرائیوں کے ساتھ جملہ مدفن میں کھڑی ہوئی کہہ رہی ہے کہ

"اگر میں دوبارہ زندگی پاؤں اور مر جاؤں تو بھی اب ایسا دلکش روضہ صفحۂ دنیا پر دست انسان سے تعمیر نہیں ہو سکتا"

بیشک! تاجگنج اپنی مجموعی حیثیت سے سلاطین مغلیہ کی فہم و فراست اور ازمنۂ قدیم کی صنعت کی ایک ایسی یادگار ہے جو کبھی فنا نہیں ہو سکتی اور جس کا جواب دنیا میں پیدا نہیں ہو سکتا ؎

اے یادگار رفتگان — اے روضۂ جنت نشان

اے روضۂ گردوں حشم — اے جنتِ ہندوستان

ہر گوشہ گوشہ تیرا ہے — آرام گاہِ قدسیان

ڈھالا ہے سانچہ میں تجھے — اے مرقدِ شاہِ جہان

اے قبر تیری گود میں — سوتا ہے اک نخلہ آشیان

تیرے مجحّر کی بنا — جیسے فراغ کہکشان

جیسے ستاروں کی چمک — دن تیری پرچھیں سازیاں

ہر کتبے سے ہے جلوہ گر — طغرا نویس کن فکاں
افشاں ہے رخ قدرت ہو یہ — یا ہیں یہ ہشت کاریاں
وہ جالیاں ہیں دلربا — یا چلمن حور جناں
آنکھوں نے دیکھا ہی نہیں — ایسی تجلی کا مکاں
ہے منحصر نظارہ پر — تیری حقیقت کا بیاں
سرمایۂ صد ناز ہے — روضہ ہے یا اعجاز ہے

وفات جہانگیر

جہانگیر کو جہاں اور شوق تھے وہاں شکار کا بھی بیحد شوق تہا۔ اور وہ شکار کھیلنے کے لئے اکثر مضافات کشمیر میں آتا تہا۔ کشمیر کے دلکش مناظر اوسکے دل کو بہت ہی بھلے معلوم ہوتے تھے اور وہ چاہے کیسے ہی مہمات میں مصروف ہو مگر سیر کشمیر سے دل فارغ نہ ہوتا تہا۔

ایک مرتبہ کشمیر سے واپسی پر جہانگیر بارہ مولا کے قریب بہرم کلہ کے مقام پر شکار کھیل رہا تہا نورجہاں ساتھ تھی اتفاقاً ایک حسین لڑکا جو ہرنوں کو دیکھنے کے لئے پہاڑی پر چڑھا ہوا تہا پاؤں پھسلنے کیوجہ سے لڑھکا اور پہاڑی کے دامن میں آتے آتے جان دیدی۔

جہانگیر کے دل پر اس واقعہ کا بیحد اثر ہوا وہ شکار چھوڑ کر سیدھا حرم سرا کو چلا آیا مگر اس لڑکے کے خیال نے اوسے بیحد تکلیف دی اور اسکی روح ضعیف ہوتی چلی گئی۔ اور چار یا پانچ ہی روز میں ۱۰۳۷ھ مطابق ۱۶۲۷ء انتقال فرمایا

اکشفی سند جو جہانگیر کے دربار میں ایک ممتاز شاعر تھے وفات جہانگیر کی تاریخ حسب ذیل کہی ہے۔

چو تاریخ وفاتش جست کشفی | خرد گفتہ جہانگیر از جہاں رفت

نورجہاں عالم بیوگی میں

ناظرین اس حیرت انگیز حالت کو ذرا غور سے دیکھیں کہ وہی نورجہاں جو ہزاروں بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کی مادر مہربان کیطرح سرپرستی کرتی تھی آج خود عالم بیوگی میں ہے اوسنے ہر قسم کا سنگھار کرنا چھوڑ دیا ہے سفید کپڑے پہنے رہتی ہے اوسکے گلاب سے رخسار مرجھا گئے ہیں اور وہ چمنستان حسن کی ایک مرجھائی ہوئی کلی معلوم ہوتی ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

ادہر تو جہانگیر کے انتقال کی خبر قلعہ معلی میں آئی ادہر آصف جاہ نے نورجہاں کی نظربندی کا حکم دیدیا اور شہزادہ خرام (شاہجہاں) کو خبر بھیجی کہ جلد سے جلد آکر سلطنت کی عنان اپنے ہاتھ میں لیں۔ چنانچہ ۳۶ برس کی عمر میں شہاب الدین محمد شاہجہاں بادشاہ، داماد آصف جاہ، سریرآرائے سلطنت ہوگئے اور نورجہاں کے ارمان دل کے دل ہی میں رہ گئے۔

شاہجہاں نے نورجہاں کو بڑے احترام اور بڑی عزت سے رکھا لیکن نورجہاں اتنی بڑی پولیٹیکل شکست کے بعد کیونکر گوارا کرسکتی تھی کہ کامیاب مخالفین میں رہکر اپنی باقی ماندہ زندگی بسر کرے اوس نے کہا کہ میں پنجاب میں رہونگی شاہجہاں نے اسے بھی بخوشی منظور کرلیا۔ اور پچیس لاکھ روپیہ سالانہ

مقرر کرکے نورجہاں کو لاہور بھیجدیا اور اوس کا بھائی دوا ابوالحسن یمین الدولہ آصف جاہ کے خطاب سے سرفراز کیا گیا اور منصب نہ ہزاری پر مامور ہوا نورجہاں لاہور کو بیحد پسند کرتی تہی۔ چنانچہ اس شعر سے اوس کے خیالات کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے ؎

لاہور را بجاں برابر خریدہ ایم　　جاں دادہ ایم و جنت دیگر خریدہ ایم

مسعود سوداگر

ہمارے ناظرین کو تعجب ہوگا کہ سوداگر نورجہاں کو جنگل سے اٹھا کر لایا تھا اور جس نے اس لعل بے بہا کو اکبر کے سامنے نذر کیا تھا اوسکا کیا حشر ہوا ہم اسکے متعلق مختصر حالات بیان کرکے اس سوانح عمری کے باقی ماندہ حصہ کو انشاء اللہ بہت جلد ختم کرتے ہیں۔

مسعود قافلہ سالار ایک سوداگر تھا جو ایران میں رہتا تھا۔ اور وہاں کی بیش بہا چیزیں بطور نذرانہ اکثر دربار شاہی میں لایا کرتا تھا جب مرزا غیاث کو اوسنے شہنشاہ اکبر کے دربار میں پہنچایا تو اوسکی رسائی اور بھی زیادہ ہوگئی۔ اسکے بعد بھی وہ اکثر آتا جاتا رہا نورجہاں اوسے "عنصر بابا" کہا کرتی تھی۔

نورجہاں کے والدین اوس کی بیحد عزت و عظمت کیا کرتے تھے۔ جب مرزا غیاث دیوان بیوتات شاہی ہوگئے تو چاہا کہ مسعود کے احسانات کا کچھہ صلہ ادا کردیں لیکن شریف الخیال مسعود نے اسے گوارا نہ کیا۔ بلکہ اب اوس کی محبت و شفقت نے یہاں تک طول کھینچا تھا کہ جب وہ شہنشاہ

سکے لئے نخفے لاتا کوئی بیش قیمت چیز نورجہاں کے لئے بھی ضرور لے کر آتا
جب نورجہاں بادشاہ بیگم ہوئی تو اتفاق سے مسعود انتقال کرچکا تھا مجبوراً
نورجہان نے اوس کے لڑکے محمود کو ایران سے بلایا اور اسکے ساتھ
روپیہ کا سلوک کیا -

وہ چاہتی تھی کہ محمود کو سلطنت میں کوئی اچھا عہدہ دلوا دے مگر محمود نے
ایران چھوڑنے پر نارضامندی کا اظہار کیا پھر بھی نورجہاں اوسے اکثر گھوڑے
ساز و سامان اور طرح طرح کے انعام واکرام دیتی رہتی تھی۔ اسی کے زیر
اہتمام اُس نے صحرائے قندہار میں اوس موقعہ پر جہاں اوس کے والدین
پیدا ہوتے ہی چھوڑ آئے تھے ایک یادگار قائم کی۔ گنبد، سرائے اور کنواں
بنوایا کہ راہگیر جو اودھر سے گذریں نورجہاں کے قصے اور خدا کی قدرت
کو بھی یاد کریں۔

مسعود سوداگر کی قبر بھی پچاس ہزار روپیہ دیکر نہایت شاندار بنوا دی

نورجہاں کی وفات

ہر آنکہ زاد بناچار بایدش نوشید ز جام دہر مے کل من علیہا فان

اللہ اللہ یا تو ایک وہ موقعہ تھا کہ نورجہاں کی بڑھتی ہوئی دولت اور چڑھتی ہوئی
جوانی کے عالم میں تصویریں کھینچ رہے تھے - یا ایک یہ موقع ہے کہ ہم سب
اُس چاند سی صورت کو مٹی میں ملانے کا حال لکھتے ہیں - مگر یہہ دن سب
کے لئے ہے کوئی کیسا ہی عالم فاضل، حسین، کامل، دولتمند، حکیم،

اور فلاسفر کیوں نہ ہو موت کا مزہ ضرور چکہے گا۔ کل من علیہا فان ویبقی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام۔

نورجہاں کی حشمت کا پانسہ اوسی وقت سے پلٹا جب سے کہ اوسکی ماں کا انتقال ہوا۔ وہ اوسی دن سے آلام پیہم میں گرفتار ہوتی چلی گئی۔ ادہر پولیٹیکل پیچیدگیوں نے اوسے اور بہی مایوس کردیا گو وہ قابلہ اور عاقلہ تہی مگر پہر بہی عورت تہی۔ مردوں کے سامنے اوسکی کیا چل سکتی تہی تاہم سیاہی عقدوں کے سلجہانے میں جو کوشش بہی اوس نے کی وہ اُس کی صنف اور لطیف الجنسی کے لحاظ سے قابل قدر اور لایق رشک ضرور ہے

اُسکی آخر عمر میں اوسکے دل پر جو گہرا اور ناقابل اندمال داغ پڑا وہ جہانگیر کا انتقال تہا اور اسی کے ساتھ اوسکی ان خواہشوں کی پامالی جن کا تعلق شہزادہ شہریار ولیعہدی سے وابستہ تہا۔ وہ ممتاز محل کی اس خوش نصیبی کو جو اوسے آصف جاہ کی ریشہ دوانیوں سے حاصل ہوتی تہی ٹہنڈے دل سے نہیں دیکھ سکتی تہی اور اسی لئے اوسنے آگرہ میں رہنا ہی پسند نہیں کیا اور لاہور بسانا گوارا کیا۔ جہانگیر کے مرنیکے بعد بارہ برس تک نورجہاں اور زندہ رہی۔ اس مدت کو اوس نے دعا اور اوراد وظائف میں گذارا رات دن خدا کی عبادت میں مصروف رہتی تہی اور جہانگیر کی مغفرت کیلئے دعائیں مانگتی تہی۔

مگر اس عالم میں بہی وہ اُن بےکسوں کے حال سے بیخبر نہ رہی جن کی وہ اپنے سہاگ کے زمانہ میں خبرگیراں تہی۔ اور اپنی جائداد کا ایک حصہ انکی سرپرستی کے لئے مستقلاً وقف کردیا۔

آخر ۱۶۴۵ء میں ایک دن عصرِ کارداں سرائے عالم سے رخصت ہو گئی ؎
روح نے یوں کہا دمِ رخصت یہ نتیجہ ہے زندگانی کا

کفن

نور جہاں نے اپنے کفن کا انتظام اپنی زندگی ہی میں کر لیا تھا۔ وہ حریر سپید کا بنا ہوا تھا اور اصفہان میں خاص طور پر تیار کیا گیا تھا۔ آیات قرآنی اسمیں بنوائی گئی تھیں۔ مکہ معظمہ بھجکر آب زمزم سے اسے دھلوایا تھا۔ حرم محترم، مدینہ منورہ نجف اشرف، کربلائے معلی اور مشہد مقدس وغیرہ مقامات کی خاک سے کفن پر خدا کے ۹۹ نام، چودہ معصومین علیہم السلام کے نام، اور ادعیۂ مغفرت لکھی گئی تھیں۔ اوس کفن کے لئے اوسنے ایک خاص داروغہ مقرر کیا تھا۔ اوسپر ہر روز قرآن شریف پڑھکر دم کیا جاتا تھا۔ اور نور جہاں کی قبر میں کربلائے معلی کی مٹی بچھائی گئی تھی۔

جنازہ

نور جہاں کے جنازہ کے ساتھ ساٹھ ہزار آدمی تھے۔ اور مرنے کے بعد بھی شاہانہ جبروت وجلال اور عظمت ووقار اسقدر ہویدا تھا کہ لوگ جنازہ کیطرف بمشکل دیکھ سکتے تھے ہزاروں غریب مسکین، اندھے، لولے، لنگڑے، یتیم، بیمار، چلا چلا کر رو رہے تھے۔ جنازہ کے ارد گرد یتیم بچوں کا حلقہ تھا اس منظر کو جو دیکھتا تھا دل تھام لیتا تھا کوئی آنکھ خشک نہ تھی اور نہ کوئی دل ساکن

تھا ملا محمد ہروی لکھتے ہیں کہ جب نور جہاں کے انتقال کی خبر پہنچی تو میں نے خیال کیا کہ وہ شیعہ تھی اسلئے غالباً اسکے جنازہ کے ساتھ صرف شیعہ لوگ ہونگے لیکن جب بغرض شرکت وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ شیعوں سے چار حصّہ زیادہ سنّی شریک جنازہ ہیں۔ اور قاضی شہر بھی بچشم گریاں ہمراہ ہیں۔

آگے موصوف لکھتے ہیں کہ سرمست شاہ قلندر کبھی نماز نہیں پڑھتے تھے لیکن نور جہاں کے جنازہ کی نماز انہوں نے صفوں سے علیحدہ ہوکر ادا کی۔ اور سجدہ کیا۔ لوگوں نے پوچھا کہ حضرت مردے کی نماز میں سجدہ کیسا۔ فرمایا کہ "خدائے زندہ راکو نماز گذرانده ایم" اور فرمایا کہ نور جہاں کے لئے یتیم بچوں کے آنسو بہشت میں محل بنوا رہے ہیں۔ بیوہ عورتوں کے اشک مسلسل لعل و یاقوت کے قصر تیار کر رہے ہیں۔ غریب اور لاچار لوگوں کی دعائیں ان محلوں کا ستون بن رہی ہیں۔ اور خدا کی رحمتیں نور جہاں کی یتیم پروری اور بیکس نوازی کا معاوضہ دینے کے لئے تیار ہیں۔

مزار

القصہ نور جہاں کا جنازہ بندوں کی دعاؤں اور خدا کی رحمتوں میں گھرا ہوا شاہدرے پہنچا، اور وہاں قبرستان جہانگیر کے جوار میں دفن کیا گیا۔
منشی محمد الدین صاحب فوق لاہوری مقبرہ نور جہاں کی موجودہ حالت کا خونچکان الفاظ میں کھینچتے ہیں۔

"نشۂ عیش میں سرشار رہنے والے عیش پرستو، رعونت و تکبر کی شراب سے

بدمست ہونیوالے غافلو، موت کے خوف اور خدا کی یاد سے غافل رہنے والے غافلو، موت کے خوف اور خدا کی یاد سے غافل رہنے والے نوجوانو، عارضی حسن پر ناز کرنے والے حسینوں نوق کے ان لفظوں کو مجذوب کی بڑ نہ سمجھو، دیکھو اور سنو، یہ دنیا فانی ہے تم بھی اسے فانی سمجھتے رہو۔ مگر کام ایسے کرتے ہو گویا تمہیں موت کبھی آنی ہی نہیں۔ نورجہاں کی طرف ہی دیکھو اسکی شان وشوکت اوسکا رعب وجلال اوسکا حسن وناز آج کہاں ہے وہ نورجہاں جس نے جہانگیر کی چاہتی ملکہ بنکر حرم سرائے شاہی میں تمام رانیوں کے چراغ بے نور کر دیئے تھے مر آج خود ایک مٹی کے چراغ کو ترس رہی ہے ؎

بر مزار ما غریباں نے چراغے نے گلے
نے پر پروانہ آید نے صدائے بلبلے

نورجہاں کا مقبرہ دیکھ کر کوئی سنگدل ہوگا جس کے دل سے آہ یا زبان سے آف یا اور آنکھوں سے آنسو نہ نکل آتے ہوں۔ افسوس نورجہاں کی قبر جسکے ہاتھ میں حکومت ہندوستان کی باگ تھی۔ آج چمگادڑوں کا مامن و مسکن ہے مقبرہ کی ٹوٹی ہوئی عمارت جسے بارہ دری کہتے ہیں چرواہے لڑکوں اور گائے بھینسوں کیلئے گرمی کے دنوں میں سائبان کا کام دیتی ہے نورجہاں کا مقبرہ عین اوس ریلوے سڑک پر واقع ہے جو لاہور سے وزیر آباد کو جاتی زمین کے احاطہ میں قبر کا تعویذ ہے۔ قبر دراصل زمین دوز ہے ایک سرنگ نورجہاں کے مقبرہ سے جہانگیر کے مقبرہ تک جاتی ہے جس میں آج کل کوئی متنفس ہی نہیں جا سکتا۔

ہم اسپر اسقدر اور اضافہ کرتے ہیں۔
نور جہاں باعتبار علم و فضل تدبیر و فہم و ادراک و دانش ہندوستان کی بیگمات میں
اس قابل تھی کہ اوسکے مسلک علم و دانش کی تقلید کیجاتی ہماری خواتین اُسکے
کارناموں سے عفت و عصمت، حلم و ضبط، صبر و شکر، اور احتیاط کے سبق
لیتیں لیکن خیر اب نئی روشنی کا دور دورہ ہے خواتین ہندوستان میں علم
کے چرچے تو بیشک ہو رہے ہیں مگر عملاً دیکھا جائے تو کچھ بھی نہیں۔ اگر آج
شاہی زمانہ ہوتا تو غالباً بیگمات شاہی کے مزاروں کی یہ ناگفتہ بہ حالت
نہ ہوتی جو آج کل مزارات زیب النساء اور نور جہاں بیگم کے متعلق سننے میں آرہی
ہے۔ مگر اب جبکہ سلطنت کا دور دورہ ہے وہ بھی آثار قدیمہ کے تحفظ میں کچھ
کم کوشاں نہیں ہے ہم اُسے بھی متوجہ کرنا چاہتے ہیں کہ جسطرح وہ آگرہ میں تاجگنج
اعتماد الدولہ اور سکندرہ وغیرہ کی مرمت و حفاظت میں دلچسپی لے رہی ہے اسیطرح
ان بیگمات اسلام کے مزارات مقدسہ کیطرف بھی نظر مراحم ڈالے اور ان کی
شکست و ریخت کا کوئی کافی انتظام کرے زیادہ ہنسی تو ہمیں اپنی قوم کی لا
پرواہی اور تغافل پر آتی ہے جب مزار نور جہاں ریلوے سڑک پر واقع ہے تو
ہزاروں مسلمان روز اس مزار کی ناگفتہ بہ حالت کو دیکھتے ہوئے چلے جاتے ہونگے
پھر کیا یہ اسلامی حمیت ہے کہ معمولی مزاروں کی مرمت کیطرف تو اسقدر توجہ
دیجاتی ہے اور مزار نور جہاں کیطرف کوئی نظر اوٹھا کر بھی نہیں دیکھتا
ہندوستان میں تعلیمیافتہ خواتین کی کچھ کمی نہیں ہے۔ اگر وہ بھی اپنے طبقات
وسیع میں دامے درمے چندہ کرکے بیگمات شاہی کے مزاروں کی حفاظت

ترصیع کا خیال کریں تو یہ مشکل کام بہت جلد آسان ہو سکتا ہے مگر کوشش اور توجہ کی ضرورت ہے۔ لاہور جہاں کا مقبرہ ہے، خود ہی ایسے ایسے صاحبان دولت وجاہ کا مسکن و مرکز ہے کہ اگر ان میں سے کوئی ایک کھڑا ہو جائے تو کم از کم موجودہ منظر کو ضرور بدل سکتا ہے۔ ہمارا مقصد یہ تو ہے نہیں کہ اسپر تاجگنج یا اعتماد الدولہ کی طرح ایک عالی شان نظر فریب عمارت قائم کی جائے۔ یا اسکے لئے عرب و عجم اور قسطنطنیہ سے انجینیر وغیرہ بلوائے جائیں بلکہ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ مزار نور جہاں جس کس مپرسی کی حالت میں پڑا ہے وہ حالت بدل جائے اور دیکھنے والوں کے دلوں پر کسی بے چارگی ویرانی کا احساس نہ ہو۔

سب سے بڑا رونا یہ ہے کہ لاہور کے اخبارات محکمہ آثار صنادید کو مزار نور جہاں کی طرف کبھی توجہ ہی نہیں دلاتے۔ کیا اسلامی ہمدردی کا ثبوت یہی ہے۔ اگر لاہور کے مسلم اخبارات کوشش کریں تو دنیا بھر سے تعمیر مزار کے لئے چندہ کر سکتے ہیں۔ لیکن کوشش کرنا ہی تو ایک بڑی بات ہے۔

مزار نور جہاں کی موجودہ حالت "تصویر عبرت" کے عنوان سے جناب مولوی حبیب الرحمن صاحب حسرت شروانی نے جس ہیکل پر اسنے خوب کھینچی ہے۔ جو بجنسہ پیش کیجاتی ہے ؎

بزم اک لاہور میں ہے خادماں قوم کی | جنکے دل سے لگ رہی ہے فکر شان قوم کی
رات دن سرگرم سب کے سب اسی کوشش میں ہیں | جسطرح ممکن ہو بڑھے اسلام کی خدمت کریں
حسرت بیدل بھی انکے شامل محفل ہوا | رنگ محفل سے سرور بیکراں حاصل ہوا

بلبلانِ قوم کے بھی چہچہے سب سُن لئے — شہر خاموشاں میں جا نکلا میں عبرت کیلئے

پھرتے پھرتے مرقدِ نورجہاں آیا نظر — مقبرہ تھا وہ کہ تھا تصویرِ عبرت سر بسر

کل تھا جسکی شان پر عالم کا دل آیا ہوا — آج عالم بیکسی کا اوس پہ ہے چھایا ہوا

جسکے رتبہ کو ہانکتا تھا بادشاہ روزگار — گردشِ گردوں سے یوں تاراج ہوا اسکا مزار

چوٹ سی دلپر لگی اُجڑی وہ حالت دیکھکر — جان ہی پر آبنی بگڑی وہ صورت دیکھکر

[illegible] غفلت کا پردہ اٹھ گیا — بیخودی نے مجھکو دکھلایا تماشہ اک نیا

[illegible] استادہ با فرشی — جو عجب حسرت سے روضہ کیطرف تھی دیکھتی

اوسکی پیشانی سے رعبِ سلطنت تھا جلوہ گر — اوسکی چتون سے برستا تھا غضب کا کروفر

دل نے آہستہ کہا یہ ہے جہانگیر غیور — مقبرہ میں سو نہ پائی اسکے دلکی تھی سرور

دیر تک تو ضبطِ بیتابی دل کرتی رہی — جوشِ بیتابی سے وہ مجبور آخر ہو گئی

[illegible] اوسنے با دلِ اندوہ گیں — یوں کیا اظہارِ دردِ دل بہ آوازِ حزیں

[illegible] کا ہے یہ خوار خستہ مقبرہ — برسوں ڈنکا جسکا ملک ہند میں بجتا رہا

میں نے جسکے سر پہ قربان چترِ شاہی کر دیا — جسکی جوتی کے تلے اورنگ شاہی کر دیا

جسکے قدموں پر فدا کر دی تھی اپنی سلطنت — جسکے آگے سر جھکا دیتے تھے اہل مملکت

جسکی صورت جلوۂ فردوس کی تصویر تھی — جسکی رنگینی بہارِ خطۂ کشمیر تھی

آہ وہ ایام عشرت آہ وہ لیل و نہار — بلبل آمل چہکتا، دیکھکر جس کی بہار

؎ مسٹر جیمس ڈگلس اپنی تصنیف "بمبئی اور مغربی ہند" میں نورجہاں کے متعلق لکھتے ہیں "وہ دن جب وہ ایک بیل گاڑی میں بیٹھکر شہر کی سیر کرتی تھی اور رنگین مزاج جہانگیر اسکا گاڑی بان ہوتا تھا"؀

جسکی رنگیں بزم رشکِ روضۂ فردوس تھی
بیکسی سے اوسکے روضہ کی ہی کیا صورت بنی

ظالموں نے قبر کا تعویذ تک چھوڑا نہیں
کونسا گوشہ ہو تربت کا کہ جو توڑا نہیں

بذلہ سنجی سے خجل ہوتی تھی جسکی پھلجڑی
حیف وہ خاموش آغوشِ لحد میں ہے پڑی

قصر میں بچھتا تھا جسکے فرش دیبا و حریر
آہ فرشِ خاک پہ سوتی ہے وہ ماہ منیر

جمگھٹے میں نازنینوں کے جو کرتی تھی بسر
آہ اوسکی قبر پر اب بیکسی ہے نوحہ گر

سیج پر پھولوں کے سوتی تھی کبھی وہ نازنیں
پھول دو سوکھے بھی اسکی قبر پر چڑھتے نہیں

جسکی پابوسی کی کرتے آرزو گلہائے تر
خشک کانٹوں کا پڑا ہے ڈھیر اوسکی قبر پہ

حسن جسکا تازگی بخشِ گلِ گلزار تھا
آہ قسمت میں لکھا اوسکے لحد کے خار تھا

قصر میں جلتی تھیں جسکے شمعہائے عنبریں
حیف روشن اک دیا بھی قبر پر اوسکی نہیں

نام روشن ہے جہاں میں آہ جسکا سر بسر
نام کو بھی روشنی آتی نہ اوسکی قبر پر

کر دئے جس نے بہت سے صاحبِ طبل و نشان
اس شکستہ مقبرہ میں وہ پڑی ہے بے نشان

جسنے صدہا خلعتِ دیبا و اطلس دیئے
حیف ترسے اسکی تربت ایک چادر کیلئے

لونڈیوں پہ جسکی تھی پوشاک کل زربفت کی
آج دیواریں ہیں اسکے روضہ کی ننگی کھڑی

تمام شد